کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ

- ازروئے قرآن حکیم ہمارا دین کیا ہے؟
- ہماری دینی ذمہ داریاں کون کون سی ہیں؟
- نیکی، تقویٰ اور جہاد کی اصل حقیقت کیا ہے

تو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے جاری کردہ

خط و کتابت کورس :

قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی

سے استفادہ کیجئے!

نیز

اللہ کے پر تاثیر کلام سے زیادہ سے زیادہ فیض یاب ہونے کی خاطر
عربی زبان سیکھنے کے لئے، اس کے ابتدائی قدم کے طور پر

عربی گرائمر خط و کتابت کورس

میں داخلہ لیجئے!

مزید برآں ترجمہ قرآن حکیم کورس میں بھی داخلے جاری ہیں

مزید تفصیلات اور پراسپکٹس کے حصول کے لئے رابطہ کیجئے :

شعبہ خط و کتابت کورسز

قرآن اکیڈمی، 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون : 5869501

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ
خَيْرًا كَثِيرًا
(البقرہ: ٢٦٩)

قرآن اکیڈمی لائبریری
K-36

ماہنامہ
حکمتِ قرآن
لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم
مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،
معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)
ادارہ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ١٧ | ذوالقعدہ ١٤١٨ھ — مارچ ١٩٩٨ء | شمارہ ٢، ٣

— یکے از مطبوعات —
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
٣٦۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ١٤۔ فون: ٥٨٦٩٥٠١
کراچی آفس: اا داؤد منزل متصل شاہ بخاری۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ٢١٦٥٨٦

سالانہ زرِ تعاون ٨٠/- روپے۔ فی شمارہ ٨/- روپے
مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور
(اس شمارے کی قیمت : ١٥ روپے)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ اوّل

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد نے خدمتِ قرآنی کے جس عظیم کام کا بیڑا اللہ کے فضل و کرم اور نصرت و تائید کے بھروسے پر اٹھایا تھا وہ بحمد اللہ اتنا وسعت پذیر ہوا کہ اس کی صدائے بازگشت پاکستان کے طول و عرض ہی میں نہیں، بیرون پاکستان بھی دُور دُور تک سنائی دینے لگی۔ قرآن کے پیغام کو اپنے مخصوص دلنشین انداز میں بڑے پیمانے پر عام کرنے اور خاص طور پر پڑھے لکھے طبقات پر قرآن کی عظمت کے گہرے نقوش ثبت کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے قرآن کے عطا کردہ "نظام عدل اجتماعی" کو غالب و نافذ کرنے اور اللہ کے کلمہ کو سربلند کرنے کی خاطر تنظیم اسلامی کے نام سے ایک اصولی انقلابی جماعت بھی تشکیل دی جس کی کوکھ سے بعد ازاں "تحریک خلافت پاکستان" برآمد ہوئی۔

محترم ڈاکٹر صاحب مدظلہ کی یہ جدوجہد ربع صدی سے بھی زائد پر محیط ہے۔ چنانچہ گزشتہ چند برسوں سے پاکستان ہی میں نہیں بیرون پاکستان بھی محترم ڈاکٹر صاحب کے افکار اور عملی جدوجہد کے حوالے سے کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر تحقیقی مقالات مرتب کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ "ڈاکٹر اسرار احمد کے تعلیمی نظریات" پر پنجاب یونیورسٹی کے ایک شعبہ میں حال ہی میں ایک تحقیقی مقالہ لکھا گیا ہے۔ قبل ازیں میک گل یونیورسٹی کینیڈا کی ایک طالبہ نے Dr. Israr Ahmed's Political Thought and Activities" کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا جو ان کے ایم اے اسلامک سٹڈیز کا ایک ناگزیر جزو تھا۔ یہ مقالہ بعد میں قریباً پونے دو سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب کی صورت میں شائع ہوا ـــــ اِسی ضمن میں ایک نہایت دلچسپ موضوع یعنی "علامہ اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد کے تعلیمی نظریات کا موازنہ" پر ایک تحقیقی مقالہ گزشتہ برس بی ایس ایڈ کے ایک طالب علم ظفر اقبال محسن نے مرتب کیا تھا جسے علمی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔ اِس مقالے کا حصہ اول زیر نظر شمارہ میں ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔ ○○

درس ۹

اثباتِ آخرت کیلئے قرآن کا استدلال

سورۃ القیامہ کی روشنی میں (۳)

○

عُجلت خیر میں بھی پسندیدہ نہیں

وقوع قیامت اور اثباتِ آخرت کے ضمن میں منکرین کے اعتراضات' اشکالات اور شبہات کے جواب کا مطالعہ مکمل کرنے کے بعد' اب ہمیں ان چار آیات (۱۶ تا ۱۹) کا مطالعہ کرنا ہے' جن میں خطاب براہ راست نبی اکرم ﷺ سے ہے اور جن میں اولاً آپؐ کو تحصیل قرآن کے ضمن میں فرط شوق و اشتیاق کی بناء پر عجلت پسندی سے نہایت شفقت و محبت کے ساتھ روکا گیا ہے' اور اس کے ساتھ ہی آپؐ کو یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ متن قرآن کے ضمن میں جمع و ترتیب اور مطالب قرآن کے ضمن میں تفتیش و تدقیق کے لئے آپؐ کو زحمت اور مشقت کی ضرورت نہیں ہے' ان جملہ امور کی کامل ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہے۔ تو آیئے کہ پہلے ان آیات مبارکہ کا ایک سلیس و رواں ترجمہ سامنے رکھ لیں اور پھر ان میں سے مقدم الذکر مضمون پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ غور کریں۔

﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ○ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ○ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ○ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ○ ﴾

"(اے نبیؐ) آپ اِس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو (تیزی سے) حرکت مت دیا کیجئے کہ اسے جلدی سے حاصل کریں۔ ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھوانا۔ تو پھر جب ہم اِسے پڑھ چکیں تو اس پڑھنے کی آپ (بھی) پیروی کیجئے'

پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اِس کی وضاحت بھی!"

یہ بات اس سے پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ قرآن مجید کا اسلوب چونکہ خطبہ کا ہے اور خطبہ میں تحویل خطاب ہوتا رہتا ہے کہ ابھی خطیب کسی ایک جانب مخاطب تھا' پھر اس کا خطاب دوسری جانب ہو گیا۔ مزید برآں کبھی وہ حاضر کو غائب فرض کر کے گفتگو کرتا ہے اور کبھی غائب کو حاضر فرض کر کے گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ سورۃ القیامہ میں اس کی ایک نمایاں مثال زیر مطالعہ آیات کی صورت میں موجود ہے۔ اس لئے کہ یہ سورۂ مبارکہ از اول تا آخر مختلف اسالیب سے منکرین قیامت کے ساتھ بحث و گفتگو اور ردوقدح پر مشتمل ہے' لیکن درمیان میں خطاب کا رُخ نبی اکرم ﷺ کی جانب مڑ گیا۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے اصل مضمون کے ساتھ اس گفتگو کا ربط و تعلق کیا ہے! اس لئے کہ چاہے کسی سلسلہ کلام میں کوئی بات ضمنی طور پر آئی ہو لیکن ظاہر ہے کہ کلام کے عمود کے ساتھ اس کا کوئی نہ کوئی ربط ضرور ہوتا ہے' خواہ وہ کتنا ہی "خفی" ہو۔ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ میں لوگوں کی گمراہی کا ایک اہم اور بنیادی سبب "حُبِّ عاجلہ" کو قرار دیا گیا ہے :

﴿ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ○ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ○ ﴾

"ہرگز نہیں' بلکہ (تمہاری گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ) تم عاجلہ کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہو اور آخرت کو نظرانداز کر دیتے ہو۔"

یعنی اِنسان کی گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ "عاجلہ" یعنی دنیا سے دل لگا بیٹھتا ہے' اسلئے کہ اسکی لذتیں بھی فی الفور محسوس ہوتی ہیں اور انسان ان سے شادکام ہوتا ہے اور اسکی کلفتیں اور اذیتیں بھی انسان کو فوری طور پر متاثر کرتی ہیں۔ گویا دنیا کا نفع بھی نقد ہے اور نقصان بھی۔ چنانچہ جب یہ "عاجلہ" انسان کا اصل مطلوب و مقصود بن جاتی ہے تو اس کائنات اور اسکی تخلیق کے وسیع ترین حقائق اور بلند ترین مقاصد انسان کی نگاہوں سے خود بخود اوجھل ہو جاتے ہیں' اور انسان کا شعور ان سے محجوب ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ آخرت کو مختلف غلط تاویلات سے نظرانداز کر دیتا ہے' بلکہ اس پر اعتراضات' اشکالات اور شبہات وارد کرتا ہے' حتیٰ کہ اسے محال مطلق گردانتا ہے اور اس کا انکار کر دیتا ہے۔

یہاں ایک نہایت لطیف لفظی مناسبت سے بات کا رُخ حضور اکرم ﷺ کی طرف موڑ دیا جاتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے : ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ۝﴾ "(اے نبیؐ!) آپ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں کہ قرآن کو جلدی سے یاد کر لیں یا حاصل کر لیں"۔ یہاں عجلت کے ذکر سے اِس عظیم حقیقت کی جانب اِشارہ فرما دیا گیا ہے کہ "عجلت پسندی" وہ چیز ہے جو خیر کے لئے بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ بلکہ "سہج پکے سو میٹھا ہو" کے مصداق خیر اور نیکی کے کاموں میں بھی مناسب تدریج اور میانہ روی پیش نظر رہنی چاہئے٬ تب ہی ان میں تمکن و استحکام بھی پیدا ہوتا ہے اور نتائج بھی صحیح اور متوازن طور پر برآمد ہوتے ہیں۔ الغرض٬ یہ تو ایک بڑی لطیف معنوی ربط کی بات تھی جس کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کی طرف خطاب کا رخ مڑ گیا۔

البتہ یہاں عجلت پسندی کے متعلق یہ بات بھی نوٹ کر لی جائے تو مناسب ہو گا کہ قرآن حکیم اس کو انسان کی طبعی کمزوریوں میں شمار کرتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہوتا ہے : ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ یعنی "انسان کی خلقت اور سرشت میں جلد بازی کا عنصر شامل ہے" (آیت ۳۷)۔ یہ بالکل وہی اسلوب ہے جو سورۃ النساء میں وارد ہوا کہ : ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا﴾ "انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے" (آیت ۲۸)۔ پس معلوم ہوا کہ انسان کی خلقت اور سرشت میں بعض پہلو ضعف کے ہیں٬ جن میں سے ایک عجلت پسندی بھی ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا : ﴿كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا﴾ "انسان بہت جلد باز واقع ہوا ہے" (آیت ۱۱)۔ اب ظاہر ہے کہ اگر اس عجلت پسندی کا رُخ شر اور نفس پرستی کی طرف ہو جائے تب تو اس کی تباہ کاری اور ہولناکی اظہر من الشمس ہے ہی٬ لیکن اگر عجلت پسندی کا رخ خیر کی جانب ہو تب بھی یہ ایک غیر مطلوب اور ناپسندیدہ شے ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال سورۂ طٰہٰ میں آئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب کوہ طور پر اللہ تعالیٰ نے طلب فرمایا تو آں جنابؑ وقت مقررہ سے پہلے پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے سوال کیا : ﴿وَمَا اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى﴾ "اے موسیٰ! تم وقت مقررہ سے قبل اپنی قوم کو چھوڑ کر کیوں آ گئے؟" حضرت موسیٰؑ نے جواباً عرض کیا : ﴿هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى﴾ "پروردگار٬ وہ بھی

میرے پیچھے پیچھے چلے آرہے ہیں اور میرے رب! میں تو تیری طرف جلدی کر کے اس لئے آیا ہوں کہ تو راضی ہو جائے" (آیات ۸۳'۸۴)۔ گویا وہ جو ایک مشہور مصرع ہے ؎ "تو میرا شوق دیکھ' مرا انتظار دیکھ!" اس میں تھوڑا سا تصرف کر لیجئے کہ ع "تو میرا شوق دیکھ' مرا اشتیاق دیکھ!" یعنی میں تو اے رب! تیری ملاقات کے شوق میں جلدی کر کے پہلے آگیا ہوں۔ لیکن اب اللہ تعالیٰ کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہوا : ﴿قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ﴾ "اللہ نے فرمایا : (اے موسیٰ' تمہاری عجلت کا نتیجہ یہ نکل چکا ہے کہ) ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو فتنہ میں مبتلا کر دیا ہے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے" (آیت ۸۵)۔ معلوم ہوا کہ اگرچہ حضرت موسیٰؑ کی عجلت اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور مخاطبہ الٰہی سے شاد کام ہونے کے اشتیاق پر مبنی تھی' جو سراسر خیر اور ہر اعتبار سے قابل تعریف جذبہ ہے' لیکن عالم واقعہ میں اس کا بھی ناپسندیدہ نتیجہ ظاہر ہوا۔

اسی سورۂ طٰہٰ میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کر کے فرمایا گیا : ﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا﴾ یعنی اے نبی ﷺ آپ کا ذوق و شوق ہمارے علم میں ہے۔ آپ کا یہ اشتیاق اپنی جگہ! لیکن ہم نے نزول قرآن کے لئے ایک ترتیب اور ایک تدریج مقرر کر رکھی ہے۔ ہماری حکمت بالغہ میں اس کا جو بھی وقت معین ہے' اس کا نزول اسی کے مطابق ہو گا۔ رہی علم کی وہ پیاس جو آپ کو اپنے قلب مبارک میں شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے تو اس کے لئے آپ دعا کرتے رہا کیجئے کہ "اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما" (آیت ۱۱۴)۔

سورۂ مریم میں یہی مضمون اس انداز میں وارد ہوا ہے کہ آنحضور ﷺ کے شوق و اشتیاق اور وحی کے انتظار کے متعلق حضرت جبرئیلؑ سے کہلوایا گیا : ﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ "ہم آپ کے رب کے حکم کے بغیر نازل نہیں ہو سکتے۔ جو کچھ ہمارے سامنے ہے اس کا اختیار بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اس کا اختیار بھی اسی کے ہاتھ میں ہے' اور جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے اس کا اختیار بھی کلیتاً اسی کے پاس ہے۔ اور آپ کا

رب بھولنے والا نہیں ہے!" (آیت : ۶۴) ـــــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ نے حضرت جبرئیلؑ سے شکوہ کیا ہوگا کہ آپ دیر دیر سے اور وقفہ دے کر آتے ہیں' بلکہ ہمیں وحی کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ اِس شکوہ کا جواب ہے جو حضرت جبرئیلؑ کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے دلوایا کہ ہم اللہ کے حکم سے وحی لے کر آتے ہیں۔ اُس کا علم کامل ہے' کائنات کی کوئی چیز اُس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ تاخیر و تعویق اس کے کسی نسیان کے باعث نہیں ہے بلکہ اس کی حکمت بالغہ کے مطابق ہے۔

پھر اسی سورۂ مریم میں حضور اکرم ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا : ﴿فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۚ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا﴾ "پس (اے نبی) آپ ان (کافروں) پر عذاب کے نزول کے لئے جلدی نہ کیجئے۔ بالتحقیق ہم اُن کے لئے (دن) گن رہے ہیں" (آیت : ۸۴)۔ یعنی یہ کفار و مشرکین ہماری گرفت میں ہیں' کہیں بھاگ کر نہیں جا سکیں گے۔ ان میں سے ہر ایک کو کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے گا۔ لیکن اس کے لئے بھی ایک مہلت ہمارے علم کامل اور حکمت بالغہ میں معین ہے ـــــ اور جیسے سورۃ الطارق میں ارشاد فرمایا گیا : ﴿فَمَهِّلِ الْكَافِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝﴾ "پس (اے نبی) ان کافروں کو ذرا کی ذرا ان کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ ان کے لئے جو ڈھیل اور مہلت ہم نے مقرر کر رکھی ہے ذرا اسے ختم ہو لینے دیجئے!" یعنی ہمارے علم کامل میں ہر چیز کا وقت معین ہے۔ اجل مسمّی کو کوئی ٹال نہیں سکے گا۔ اور جب وہ وقت معین آجائے گا تو ان کا حساب پاک کر دیا جائے گا۔

الغرض یہاں پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی کہ اے نبی! آپ قرآن کو یاد کرنے کے لئے جلدی نہ کیا کیجئے اور اس کے لئے اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیا کیجئے ـــــ اور اس مضمون کو عجلت کی لفظی مناسبت کی بناء پر سورۃ القیامہ میں نگینے کے مانند جڑ دیا گیا کہ عجلت پسندی تو وہ شے ہے جو نیکی اور خیر کے کاموں کے ساتھ بھی مناسبت نہیں رکھتی' کجا یہ کہ انسان پر "حُبِّ عاجلہ" کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ اس کی ساری جدوجہد' سعی و محنت اور تگ و دو کا مقصود و مطلوب ہی صرف "عاجلہ" یعنی دنیا کی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت کا حصول بن کر رہ جائے۔ تو اس کے جو خراب نتائج نکلیں گے ان کا تم خود بخوبی اندازہ کر سکتے ہو۔ اس پورے مفہوم کو دریا کو کوزے میں بند کرنے کے انداز میں نہایت فصاحت و

بلاغت کے ساتھ ان دو آیات میں سمو دیا گیا۔ یعنی تمہاری تمام تر گمراہی اور ضلالت' اور کفر و تکذیب' اور اعراض و انکار کا اصل سبب یہ ہے کہ تم عاجلہ (اس دنیا) کی محبت میں گرفتار ہو اور آخرت کو نظرانداز کر دیتے ہو۔

یہاں ضمناً ایک وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید میں "سَارِعُوْا" اور "سَابِقُوْا" کے الفاظ بھی متعدد مقامات پر وارد ہوئے ہیں' جیسے سورۂ آل عمران میں فرمایا : ﴿ وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ اور دوڑ لگاؤ اپنے رب کی مغفرت کی طرف!" (آیت ۱۳۳) اسی طرح سورۃ الحدید کی آیت ۲۱ میں فرمایا گیا : ﴿ سَابِقُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ "ایک دوسرے سے آگے نکلو اپنے رب کی مغفرت کی طرف!"۔ "سَارِعُوْا" اور "سَابِقُوْا" فعل امر کے صیغے ہیں۔ سورۃ المومنون کی آیت ۶۱ میں مومنین صادقین کے اوصاف کے ضمن میں یہ دونوں الفاظ خبریہ انداز میں فعل مضارع اور اسم فاعل کی صورت میں وارد ہوئے ہیں : ﴿ اُولٰٓئِكَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴾ "یہی لوگ ہیں جو بھلائیوں کے لئے تیز گام ہیں اور اس راہ میں سب سے آگے نکل جانے والے ہیں"۔ سرِع' یسرَع سے باب مفاعلہ کا مصدر ہے "مسارعة" اور سبَق یسبِق سے باب مفاعلہ ہی کا مصدر ہے "مُسَابَقَة" ـــــــ اور یہ دونوں قریب المفہوم اور تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ ان دونوں کا مفہوم ہے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں دوڑ لگانا۔ البتہ مسارعت و مسابقت اپنے اساسی مفہوم کے اعتبار سے عجلت پسندی سے قدرے مختلف شے ہے۔ واضح رہے کہ مسارعت اور مسابقت کا جذبہ بھی طبع انسانی میں ودیعت شدہ موجود ہے۔ چنانچہ ہر انسان دوسرے لوگوں سے آگے نکلنا اور بڑھنا چاہتا ہے۔ قرآن مجید مسارعت و مسابقت کے اس جذبہ کے رخ کو خیر کی طرف موڑ دینا چاہتا ہے۔ وہ انسان کو تعلیم دیتا اور تلقین کرتا ہے کہ "دنیا" یعنی دنیوی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت کے حصول میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی سعی و کوشش کرنے کے بجائے تم بھلائیوں میں' نیکیوں میں' خیر میں' خدمت خلق میں' عبادات کی بجا آوری میں' دین کے احکام اور اس کے اوامر و نواہی کی تعمیل میں' دین کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت کی سعی و جہد میں اور اقامت دین اور غلبہ دین کے لئے انفاق مال اور

بذل نفس میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ یہ اللہ کی مغفرت اور جنت کے شاہ درے ہیں۔

البتہ ہر کام کے لئے مناسب تدریج بھی ضروری ہے اور اس کی جملہ شرائط کو پورا کرنے میں جو مناسب وقت لگنا چاہئے اس کے ضمن میں صبر کا مظاہرہ بھی ضروری ہے۔ جیسے اگر نماز کو بہت جلدی جلدی پڑھا جا رہا ہو تو حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق ایسی نماز ادا نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک بدوی مسلمان نے مسجد نبویؐ میں آکر جلدی جلدی نماز پڑھ لی تو حضور ﷺ نے اس سے فرمایا : ((صَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ)) "دوبارہ نماز پڑھ' اس لئے کہ تیری نماز ادا نہیں ہوئی"۔ لہٰذا نماز کے ہر رکن کا حق پورے سکون اور ٹھہراؤ کے ساتھ ادا کرنا ضروری اور لازمی ہے۔ اسی طرح اگرچہ قرآن حکیم میں نماز جمعہ کے بارے میں فرمایا گیا : ﴿اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ﴾ جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ "جب نمازِ جمعہ کے لئے اذان ہو جائے تو اللہ کی یاد کے لئے دوڑو۔" لیکن تمام مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہاں سعی (فاسعوا) سے دوڑنا مراد نہیں ہے۔ اس لئے کہ نماز کے لئے دوڑ کر آنے سے حضور اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے' یہ وقار اور سکینت کے منافی ہے۔ لہٰذا یہاں سعی سے مراد لپکنا ہو گا۔ یعنی اپنے تمام کاموں سے ذہنی و عملی تعلق توڑ کر جمعہ کی نماز کے لئے لپکو اور ہمہ تن اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

اللہ کی جانب سے متن قرآن کی حفاظت
اور معانی قرآن کی وضاحت کی ضمانت

آیت ۱۶ میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے جو بات فرمائی گئی یعنی آنحضورؐ کو اپنی زبان مبارک کو قرآن حکیم کے ساتھ تیزی کے ساتھ حرکت دینے سے کمال شفقت و محبت کے ساتھ روکا گیا' تو آپؐ کے اس طرز عمل کا ایک سبب تو وہ تھا جو جلی انداز میں بیان کر دیا گیا' یعنی آپؐ کی قرآن حکیم کے ساتھ غایت درجہ کی محبت اور اس کا حد درجہ

شوق' جس کے نتیجے میں آپؐ نازل شدہ آیات قرآنی کو جلد از جلد یاد کرلینا چاہتے تھے تاکہ مزید وحی نازل ہو ـــــ لیکن آیت ۱۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے وحی قرآنی کو یاد کرنے کے لئے تیزی سے زبان مبارک کو حرکت دینے اور اس طرح شدید مشقت برداشت کرنے کا ایک دوسرا سبب بھی تھا' اور وہ یہ کہ آپؐ چاہتے تھے کہ آپؐ وحی کے الفاظ کو اچھی طرح یاد کرلیں' مبادا اس کا کوئی حصہ آپؐ کی یادداشت میں محفوظ نہ رہے اور اس طرح قرآن مجید کا کوئی لفظ یا کوئی آیت ضائع ہو جائے۔ چنانچہ آپؐ کی اس تشویش کو رفع کرنے کے لئے ارشاد فرمایا گیا : ﴿اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ﴾ "یقیناً ہمارے ذمے ہے اس (قرآن) کو جمع کر دینا بھی اور اس کا پڑھنا (یا پڑھوانا) بھی!"

وجوبِ حفاظتِ قرآن

یہ آیہ مبارکہ جمع و ترتیب قرآن اور حفاظت متن قرآن کے ضمن میں قرآن حکیم کی اہم ترین آیت کی حیثیت رکھتی ہے' اس لئے کہ اگرچہ سورۃ الحجر کی آیت ۹ میں بھی حفاظت قرآن کے ضمن میں اللہ کا پختہ وعدہ وارد ہوا ہے کہ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝﴾ "یقیناً ہم نے ہی اس نصیحت اور یاددہانی کو نازل فرمایا ہے اور خود ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں" لیکن یہ حقیقت بادنیٰ تامل واضح ہو جاتی ہے کہ اس موضوع پر قرآن کا ذروۂ سنام سورۃ القیامہ کی آیت ۱۷ ہی ہے' اس لئے کہ ایک تو اس میں حفاظت کی مزید وضاحت دو الفاظ کے ذریعے کی گئی یعنی "جَمْعَهٗ" اور "قُرْاٰنَهٗ" اور دوسرے اس میں جو حرف جار "علٰی" وارد ہوا ہے (عَلَیْنَا) اس کا لازمی نتیجہ "وجوب" ہے' یعنی جمع و ترتیب قرآن اور حفاظت متن قرآن کو اللہ نے اپنے اوپر واجب کرلیا ہے' اور اگرچہ اہل سنت ایک کلامی اختلاف کے باعث اللہ تعالیٰ پر کسی چیز کا "وجوب" تسلیم نہیں کرتے' لہٰذا اس مقام پر اس سے مراد "وجوب" نہیں بلکہ "وعدہ" لیتے ہیں' لیکن ظاہر ہے کہ اس کا حاصل بھی وہی ہے' اس لئے کہ اللہ کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں دو بار یہ ارشاد فرمایا کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ﴾ "یقیناً اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا!" (آل عمران : ۹ اور الرعد : ۳۱) اور دو

ہی بار یہ فرمایا کہ "اللہ ہرگز خلاف نہیں کرے گا اپنے وعدے کے!" (البقرہ : ۸۰ اور الحج : ۴۷) گویا اللہ تعالیٰ اور قرآن حکیم پر ایمان رکھنے والے کسی شخص کو قرآن مجید کے متن کی سالمیت اور محفوظیت کے معاملے میں ہرگز کبھی کسی قسم کا شک و شبہ لاحق نہیں ہو سکتا۔

جمع قرآن کے دو مراحل

اس آیہ مبارکہ میں جمع قرآن کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی جس ذمہ داری کا ذکر ہے اس کا اولین مصداق تو جمیع مفسرین و محققین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ نے قرآن مجید کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک میں جمع فرما دیا تھا۔ یہ تو ایک ایسی حقیقت ہے جس کے ضمن میں کسی کو کوئی اختلاف یا اشتباہ ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ جمع قرآن کے دوسرے مرحلے کے ضمن میں مختلف النوع شبہات لاعلمی کے باعث بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں پائے جاتے ہیں۔

جمع قرآن کا یہ مرحلہ ثانی قرآن مجید کو ایک کتابی شکل میں جمع کرنے کا تھا جو بالاجماع نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد طے پایا' اس لئے کہ اس پر اتفاق ہے کہ "مَا بَیْنَ الدُّفَّتَیْن" (جلد کے دو گتوں کے درمیان) قرآن کا ایک کتاب کی صورت میں جمع ہو جانا آنحضورؐ کی حیات دنیوی کے دوران نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت تک قرآن جس طرح نبی اکرم ﷺ کے سینہ مبارک میں جمع تھا اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد کے بھی صرف سینوں میں محفوظ تھا۔

اس مرحلہ ثانی کے بارے میں ایک بالکل غلط اور بے بنیاد بات تو وہ ہے جو خلیفہ ثالث ذوالنورین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ قافیہ کی مناسبت سے "جَامِعُ آیاتِ القُرآن" کے الفاظ چسپاں کر دینے کے باعث بہت بڑے حلقے میں پھیل گئی ہے' جس سے ذہنوں میں خواہ مخواہ یہ وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید قرآن کتابی صورت میں نبی اکرم ﷺ کے وصال کے کم از کم پندرہ بیس سال بعد جمع ہوا' اور یہ وسوسہ منطقی طور پر بہت سے شکوک و شبہات کو جنم دینے کا باعث بن جاتا ہے' جبکہ واقعہ

اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ مصحف کی صورت میں قرآن مجید کے جمع ہو جانے کا مرحلہ تو دور خلافت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی میں 'گویا نبی اکرم ﷺ کی وفات کے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سال کے اندر اندر' طے پا گیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے تو فی الواقع اُمت کو قرآن کے ایک رسم الخط پر جمع کیا تھا۔ گویا اگر قافیہ کی رعایت ہی ملحوظ رہے تب بھی اُن کی شان میں "جامِعُ الْاُمَّةِ عَلَی القُرآن" کے الفاظ زیادہ موزوں بھی ہیں اور مطابق واقعہ بھی!

سورتوں اور آیات کی ترتیب

جمع قرآن کے ضمن میں دوسرا بڑا وسوسہ اور مغالطہ آیات اور سورتوں کی باہمی ترتیب سے متعلق ہے' جس کے ازالے کے لئے اولاً تو لفظ "جَمْعَهٗ" ہی میں واضح اشارہ موجود ہے' اس لئے کہ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ قرآن کا جمع ہونا بغیر ترتیب کے ممکن نہیں ہے۔ ثانیاً اس کی مزید وضاحت و صراحت دوسرے لفظ یعنی "قُرْاٰنَهٗ" کے ذریعے کر دی گئی' جس کا ترجمہ "اس کا پڑھنا" بھی کیا جا سکتا ہے اور "پڑھوانا" بھی۔ لیکن اگر اس اصول کو پیش نظر رکھا جائے کہ "قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر و توضیح کرتا ہے" تو سورۃ الاعلیٰ کی آیت ۶ ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى﴾ یعنی "ہم عنقریب آپ کو پڑھوا دیں گے تو آپ بھولیں گے نہیں" کے مطابق یہاں بھی زیادہ موزوں ترجمہ "پڑھوانا" ہی ہو گا۔ چنانچہ اگلی آیت مبارکہ یعنی ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ "تو جب ہم پڑھوائیں تو آپ اسی پڑھوانے کی پیروی کریں" مزید دلالت کر رہی کہ یہاں زیادہ زور اور تاکید ترتیب قرآنی کے بارے میں ہے' اس لئے کہ اولاً پڑھوانا لامحالہ کسی ترتیب ہی کے ساتھ ممکن ہے اور ثانیاً نبی اکرم ﷺ کو اسی ترتیب کی پابندی اور پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔

"قَرَاْنَاهُ" میں جو ضمیر فاعلی جمع متکلم کے صیغہ میں موجود ہے اس کے بارے میں اگرچہ دو احتمالات موجود ہیں' یعنی ایک یہ کہ اس کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہو اور دوسرے یہ کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہوں' لیکن بمفہوم آیات قرآنی ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ "جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اصلاً اللہ ہی کی اطاعت کی" (النساء:۸۰) اور ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ "یقیناً جو لوگ (اے

نبیؐ) آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کر رہے ہیں" (الفتح ۱۰) ان دونوں احتمالات سے معنی اور مراد میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ گویا فی الحقیقت تو اس پڑھوانے کا فاعل حقیقی اللہ سبحانہ و تعالیٰ خود تھا' لیکن مجازاً یا بالفعل یہ پڑھوانا حضرت جبرئیل علیہ السلام کا فعل تھا۔ چنانچہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ آنحضورؐ ہر رمضان مبارک میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کا دَور فرمایا کرتے تھے اور اپنی حیات دنیوی کے آخری رمضان المبارک میں آپؐ نے پورے قرآن کا دو مرتبہ دَور مکمل کیا' اور ظاہر ہے کہ نہ آپؐ کا یہ دَورۂ قرآن کسی ترتیب کے بغیر ممکن تھا' نہ ہی آپؐ کے صحابہؓ میں سے جو حضرات پورے قرآن کے حافظ تھے وہ بغیر کسی ترتیب کے حفظ کر سکتے تھے۔

غرضیکہ عقلاً اور نقلاً ہر اعتبار سے یہ بات مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو ایک خاص ترتیب سے نبی اکرم ﷺ کے سینہ مبارک میں جمع کیا اور اسی ترتیب کے ساتھ آنحضور ﷺ نے اُمت کو قرآن سکھایا اور یاد کرایا اور امانت خداوندی کو کامل دیانت کے ساتھ اُمت کے حوالے کر دیا' جیسے کہ آپؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا ((تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِہٖ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَہٗ کِتَابَ اللّٰہِ)) "میں چھوڑ کر جا رہا ہوں تمہارے مابین وہ چیز جسے اگر تم مضبوطی سے تھامے رہے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے' یعنی اللہ کی کتاب!"

غلط فہمی کا سبب

اس ضمن میں مغالطہ کا سبب یہ ظاہر و باہر اور متفق علیہ حقیقت ہے کہ قرآن کی ترتیب نزولی مصحف کی ترتیب سے بالکل مختلف تھی۔ لیکن اگر ترتیب نزولی اور ترتیب مصحف کے فرق کی حکمت کو سمجھ لیا جائے تو شیطان کو کسی وسوسہ اندازی کا موقع نہیں مل سکتا۔

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن اللہ کا وہ کلام قدیم ہے جو ازل سے "لوح محفوظ" (البروج : ۲۲) یا "اُمّ الکتاب" (الزخرف : ۴) یا "کتاب مکنون" (الواقعہ : ۷۸)

میں درج ہے' اور یہ وہ ابدی ہدایت نامہ ہے جو تاقیام قیامت تمام انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کفایت کرے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ ؎

"نوع انساں را پیام آخریں حامل او رحمتہ للعالمیں!"

اس کا نزول نبی اکرم ﷺ پر ایک خاص زمانے میں اور مخصوص حالات کے تناظر میں ہوا' اور یہ قرآن کا عظیم اعجاز ہے کہ اس کی آیات بینات ترتیب کے ذرا سے فرق کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی حیات دنیوی کے دوران بدلتے ہوئے حالات و واقعات پر اتنے معجزانہ طور پر چسپاں ہوتی چلی گئیں جیسا کہ وہ خاص اِن ہی حالات کے لئے نازل ہوئی ہوں' اور اِس طرح آنحضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنی دعوت و تحریک کے جاں گسل حالات و واقعات اور مسائل و مشکلات کے ضمن میں بروقت ہدایت و رہنمائی ملتی چلی گئی' جس سے آپؐ کے قلب مبارک کو بھی جماؤ اور ٹھہراؤ اور استقامت حاصل ہوتی چلی گئی اور آپؐ کے صحابہؓ کے دلوں کو بھی سہارا ملتا رہا اور ان کی ڈھارس بندھی رہی۔ چنانچہ یہی بات ہے جو سورۃ الفرقان کی آیت ۳۲ میں بیان ہوئی ہے کہ ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝ ﴾ "اور کافروں نے کہا کہ ان پر قرآن ایک ہی مرتبہ پورا کیوں نہ نازل کر دیا گیا؟ (اس کا جواب یہ ہے کہ) ہم نے یہ اس لئے کیا کہ اس کے ذریعے (اے نبیؐ) آپ کے دل کو جماؤ عطا فرما دیں' پس ہم نے اسے پڑھوایا تھوڑا تھوڑا کر کے!"

گویا ترتیب نزولی کی اصل حکمت یہ تھی کہ آپ ﷺ کی دعوت جن جن مراحل سے گزر رہی ہے اور آپؐ کی جدوجہد کو جن جن موانع سے سابقہ پیش آ رہا ہے ان کی مناسبت سے آیات قرآنیہ نازل ہوتی چلی جائیں تاکہ آپؐ کو بروقت رہنمائی ملے اور ہر مرحلے پر جو اعتراضات آپؐ پر کئے جائیں' یا جو سوالات و اشکالات آپؐ کے سامنے پیش کئے جائیں ان سب کا حل اور جواب ساتھ کے ساتھ ملتا چلا جائے' جبکہ ترتیب مصحف وقتی حالات کے تابع نہیں ہے بلکہ لوح محفوظ' یا کتاب مکنون' یا اُم الکتاب کے عین مطابق ہے اور اس کا اصل ہدف ابدی ہدایت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیات اور سورتوں کی اِس

ازلی اور ابدی ترتیب میں غور و فکر کرنے والوں کو عظیم حکمتوں اور علوم و معارف کے نہ ختم ہونے والے خزانوں کا سراغ ملتا ہے اور اس سے علم و حکمت قرآنی کے نئے نئے گوشے روشن ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی وہ ترتیب ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو نبی اکرم ﷺ کے سینہ مبارکہ میں جمع فرمایا اور اسی کی پیروی اور پابندی کا آپؐ کے متبعین کو حکم دیا' اور یہی ترتیب اب ہمیشہ کے لئے دین میں حجت ہے!!

البتہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن مجید کو ایک کتاب کی شکل میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دَور خلافت میں اُس وقت مرتب اور جمع کیا جب جنگ یمامہ میں بہت سے حفاظ صحابہؓ شہید ہو گئے اور اندیشہ ہوا کہ کہیں اِس طرح نوع انسانی قرآن سے محروم نہ ہو جائے۔ چنانچہ آں جنابؓ نے نبی اکرم ﷺ کے زمانہ مبارک کے جملہ کاتبین وحی کو جمع کر کے اور حضرت زیدؓ بن ثابت کو اُن کا ناظم اور سربراہ بنا کر اس کمیٹی کے سپرد یہ کام کیا کہ قرآن مجید کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کر لیں۔ چنانچہ پورا قرآن کریم جو حفاظ کرام کے سینوں میں محفوظ تھا اور جس کے بعض اجزاء اور مختلف سورتیں بعض صحابہؓ کے پاس تحریری شکل میں بھی موجود تھیں' ان سب کی مدد سے قرآن مجید کو "بین الدُّفَّتین" یعنی جلد کے دو گتوں کے درمیان کتابی شکل میں جمع کر لیا گیا۔

البتہ اس کے پڑھنے میں اہل عرب کے مختلف لہجے تھے۔ اُردو زبان کے بھی مختلف لہجے ہیں' چنانچہ لکھنوی لہجہ اور ہے اور دہلی کا لہجہ اور' اسی طرح حیدر آبادی لہجہ جدا ہے اور ہماری لہجہ جدا' اور ابتداء لوگوں کی سہولت کے لئے انہیں قرآن مجید کو اپنے اپنے لہجوں میں پڑھنے کی اجازت تھی' لہٰذا مختلف لہجوں کا اثر قرآن کریم کی کتابت و قراءت میں بھی آ رہا تھا ـــــ چنانچہ اُمت پر یہ احسان عظیم حضرت عثمان ذوالنورینؓ کا ہے کہ آپؓ نے اپنے دورِ خلافت میں اُمت کو قرآن کے ایک رسم الخط پر جمع کیا۔ گویا آنجنابؓ قرآن کریم کو جمع کرنے والے نہیں ہیں بلکہ اُمت کو قرآن کی ایک کتابت پر جمع کرنے والے ہیں۔

الغرض سورۃ القیامہ کی یہ دو آیات ﴿اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ○ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ○﴾ یعنی "اے نبیؐ ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا بھی اور اس کا پڑھوانا بھی' تو جب

ہم اسے پڑھوائیں تو آپ اس کو اسی ترتیب سے پڑھئے۔" حفاظت متن قرآن اور جمع و ترتیب قرآن کے ضمن میں قرآن کا ذروۂ سنام ہیں۔

اس کے بعد آیت ۱۹ میں فرمایا ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝﴾ "پھر ہمارے ہی ذمے ہے اس کی تبیین یعنی توضیح و تشریح" ـــــ یہ بات بھی نہایت اہم ہے' اور جس طرح جمع قرآن کے دو مرحلے تھے' اسی طرح اس کے بھی دو حصے ہیں' جن کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ چنانچہ ایک حصہ تو یہ ہے کہ جب قرآن مجید میں نازل شدہ احکام کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں کچھ سوالات پیدا ہوتے تھے تو بعد میں توضیحی آیات نازل ہو جاتی تھیں' ایسی آیات بعض اوقات تو اسی حکم کے ساتھ متصلاً درج کر دی گئی ہیں' بعض اوقات انہیں کسی قدر فصل کے ساتھ درج کیا گیا ہے' اور بعض اوقات سورۃ کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ رمضان کے روزوں کے بارے میں تفصیلی احکام پر مشتمل آیت سورۃ البقرہ کے اسی تیئیسویں رکوع کے آخر میں شامل کر دی گئی جس میں ابتدائی حکم درج ہے' جبکہ دوسری اور تیسری صورتوں کی نمایاں مثالیں سورۃ النساء میں موجود ہیں۔ ایسی توضیحی آیات کے ساتھ آپ اکثر دیکھیں گے کہ یہ الفاظ آتے ہیں ﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ﴾ "اسی طرح اللہ اپنی آیات کی تبیین اور وضاحت فرما دیتا ہے۔"

الغرض ایک تو تبیین قرآن یعنی قرآن مجید کی مزید تشریح و توضیح کی صورت یہ ہے کہ وہ خود قرآن ہی کے ذریعے ہو گئی۔ اس کے علاوہ اس کا ایک دوسرا نظام بھی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرض منصبی قرار دیا گیا کہ آپ قرآن مجید کی تشریح و توضیح اور تبیین فرمائیں' چنانچہ سورۃ النحل کی آیت ۴۴ میں فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ "(اے نبی ﷺ) ہم نے آپ پر یہ الذکر (یعنی قرآن) نازل فرمایا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لئے وضاحت کریں اس چیز کی جو ان کے لئے نازل کی گئی ہے" ـــــ گویا قرآن مجید کی توضیح و تبیین کی ایک صورت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت خصوصی یا وحی خفی پر مبنی سنت رسولؐ کے ذریعے سامنے آئی۔ اس سلسلے میں کچھ کج فہم اور گم کردہ راہ لوگوں کا یہ اِشکال بالکل بے بنیاد ہے کہ اگر قرآن پر سنت رسولؐ کا اضافہ کیا جائے تو یہ قرآن کی توہین ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن

مکمل نہیں ہے اور وہ اپنی وضاحت کے لئے سنت کا محتاج ہے۔ معاذ اللہ' کوئی صاحب ایمان قرآن کے متعلق ہرگز یہ تصور اور خیال نہیں رکھتا کہ قرآن سنت کا محتاج ہے' البتہ تمام مسلمانوں کا اجماعی و متفق علیہ مؤقف یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو سمجھنے اور اس کی رہنمائی پر عمل پیرا ہونے کے لئے سنت رسولؐ کے محتاج ہیں۔ گویا یہ احتیاج ہماری ہے کہ ہم فہم قرآن اور عمل بالقرآن کے لئے نبی اکرم ﷺ کے اقوال اور افعال مبارکہ کو اپنے سامنے رکھیں اور دیکھیں کہ حضور اکرم ﷺ نے قرآن مجید پر کس طرح عمل کر کے دکھایا ہے اور تعلیمات قرآن کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے دائروں میں کس طرح بالفعل کیا اور اس طرح اس کا عملی نمونہ پیش فرمایا۔ اس لئے کہ اسی کے حوالے سے ہم قرآن مجید کو صحیح طور پر سمجھ بھی سکیں گے اور اِس پر عمل بھی کر سکیں گے' اور سنت کی یہ تبیین بھی حکماً ہدایت قرآن ہی کا حصہ ہو گی' اس لئے بھی کہ اس تبیین قرآن کا حکم اللہ ہی نے آپؐ کو دیا ہے ـــــ اور اس لئے بھی کہ قرآن حکیم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے متعدد کاموں کو صراحتاً اپنی طرف منسوب فرمایا ہے' جس کی ایک نمایاں مثال سورۃ الانفال میں وارد ہوئی ہے کہ غزوۂ بدر میں نبی اکرم ﷺ نے کنکریوں کی مٹھی بھر کر کفار کی طرف پھینکی تو اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا : ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ "(اے نبی!) جب آپؐ نے کنکریاں پھینکی تھیں تو آپؐ نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں"۔ علامہ اقبال نے اسی بات کو یوں تعبیر کیا ہے ؎

گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

الغرض ـــــ معانی و مطالب قرآن کی وضاحت کا ذمہ بھی از روئے آیہ مبارکہ اللہ نے خود لیا تھا ـــــ جو کچھ تو خود قرآن حکیم کی توضیحی آیات کے ذریعے پورا ہوا اور اکثر و بیشتر سنت رسول ﷺ کے ذریعے پورا ہوا۔

بَارَكَ اللّٰهُ لِيْ وَلَكُمْ فِي الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ' وَنَفَعَنِيْ وَاِيَّاكُمْ بِالْاٰيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ○○

وقت کے نہایت اہم' انتہائی نازک اور حساس موضوع پر

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی وقیع تالیف

شیعہ سنی مفاہمت
کی ضرورت و اہمیت

شائع ہو گئی ہے۔ جس میں مذکورہ بالا موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب کے فکر انگیز خطاب کے ساتھ ساتھ درج ذیل موضوعات پر مضامین بھی شامل ہیں :

i) حضرت مہدی موعود کی شخصیت کے بارے میں اہل سنت و اہل تشیع کا موقف (از : ڈاکٹر اسرار احمد)

ii) امیر تنظیم اسلامی کے سفر ایران کے مشاہدات و تاثرات

iii) اسلام میں مختلف مسالک کی حیثیت اور مفاہمت کا راستہ

(خطاب : آیت اللہ محمد واعظ زادہ خراسانی)

صفحات ۱۳۴' سفید کاغذ' عمدہ طباعت' قیمت ۴۰ روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

علوم وفنون کی ترقّی میں مُسلمانوں کا کردار

پروفیسر ممتاز احمد اعوان

علم و حکمت کی جو خدمت مسلمانوں نے سرانجام دی' وہ تہذیب انسانی پر ایک عظیم اِحسان ہے۔ قرآن حکیم نے تحقیق و مشاہدے کی جس روح سے اِنسانیت کو متعارف کروایا وہ روح' انسانیت کے لئے نئے نئے علوم و فنون کی ایجاد کا ذریعہ بن گئی۔ علوم و فنون کی یہ ترقی جس سرعت اور تیزی کے ساتھ انجام پائی وہ کمیت اور کیفیت' ہر دو اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ قرنِ اول میں مسلمان جوں ہی اپنی بقا کی جنگوں سے فارغ ہوئے تو وہ فوری طور پر علوم و فنون کی ترقی و خدمت کے لئے مصروف کار ہو گئے۔ قرآن کی دی ہوئی تحقیق و جستجو کی روح نے ان کے اندر حوصلہ اور ہمت پیدا کی۔ تاریخ انسانی محوِ حیرت ہے کہ انہوں نے حیران کن سرعت کے ساتھ نہ صرف جنگی کامیابیاں حاصل کیں بلکہ اِسی سرعت کے ساتھ علوم و فنون میں بھی مقام حاصل کر لیا۔ ڈاکٹر امین خیراللہ اِس سلسلے میں لکھتے ہیں :

Within a hundred years after the death of their Prophet, the Arabs had consolidated their widespread empire and had turned their genius to the arts of peace. {*Dr. Ameen Khairullah, Arabian contribution to Medicine P.8*}

"عرب مسلمانوں نے پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد سو برس کے اندر اندر ہی اپنی وسیع و عریض مملکت کو مستحکم کر لیا اور اپنی صلاحیتوں کو فنون کے لئے صرف کر دیا تھا۔"

Allen O.Whipple لکھتے ہیں :

The rapid rise and spread of Arab empire to proportions never reached in modern civilization, and

the encouragement and developement of the arts and sciences by the Arab conquerors within a period of two centuries after the advent of the Prophet Muhammad constituted one of the most fascinating and significant chapter in all the history. {p.15}

"پیغمبر اسلامؐ کی بعثت سے دو سو برس کے اندر اندر ہی عربوں کی سلطنت کا تیزی سے ابھرنا اور اتنی تیزی کے ساتھ پھیل جانا کہ موجودہ تہذیب اِس تک نہیں پہنچ سکتی' اور عربوں کے ذریعے سائنسی علوم و فنون کی حوصلہ افزائی اور ترقی' تاریخ کے پورے کے پورے ذخیرے کا ایک عظیم اور اہم باب ہے۔"

یورپ کی موجودہ سائنسی اور تکنیکی ترقی دراصل مسلمانوں ہی کی مرہون منت ہے۔ مسلمانوں نے وہ تمام علوم و فنون یورپ کے سپرد کئے' جنہیں موجودہ سائنسی دور کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔

اِسلامی تہذیب وحشیوں اور علم دشمنوں کی تہذیب نہ تھی بلکہ وہ علم و حکمت کے شیدائی تھے۔ انہیں ہادی اسلام نے یہ تعلیم دی تھی کہ "علم و حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے لہٰذا وہ جہاں سے ملے اسے حاصل کر لو"۔ مسلمان اسی ارشاد نبویؐ پر عمل پیرا ہوئے۔ انہوں نے یونان کے علوم و فنون کو تہس نہس نہیں کر دیا بلکہ وہ ان علوم کے محافظ و نگہبان بن گئے۔ انہوں نے وسعت نظری کا ثبوت دیا۔ مسلمانوں کا ایک عظیم احسان یہ ہے کہ انہوں نے ایک زوال یافتہ تہذیب کے علمی ورثے کو تباہ ہونے سے بچالیا۔ اس ورثے کو نہ صرف تباہی سے بچایا بلکہ اس ورثے کو عربی میں منتقل کر کے اس میں بیش بہا اضافے بھی کئے' اس میں اصلاحات کیں' اور اپنے بعد آنے والی تہذیب یورپ کے ہاتھوں میں اس ورثے کو تھمایا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر امین خیر اللہ لکھتے ہیں۔

"مسلمانوں نے یونانی اور رومی سائنس اور کلچر کو نقصان سے بچایا۔ اِس سائنس میں اُنہوں نے اپنی تحقیقات و مشاہدات سے اضافے کئے اور یورپ والوں کو وہ Talent کئی گنا زیادہ کر کے سپرد کیا جسے انہوں نے اہل یونان سے حاصل کیا تھا۔ جب مسلمانوں کا زوال ہوا تو وہ اس اعتبار سے یونانیوں سے زیادہ خوش قسمت نہ تھے جن کی تہذیب کو مسلمانوں نے بچالیا تھا۔ یعنی یونانی اِس اعتبار سے

خوش قسمت تھے کہ مسلمانوں نے ان کے علوم وفنون کے ذخائر کو بچالیا تھا۔"
(بحوالہ سابق 'ص ۸'۹)

اس کے برعکس ڈاکٹر موصوف مسلمانوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"مسلمانوں کی سلطنت کے زوال کے وقت ان کے لاتعداد مفکرین کے شاہپاروں میں سے بہت کم کو بچایا جاسکا تھا۔" (ایضاً)

مسلمانوں کے ساتھ اس کے بالکل برعکس سلوک کیا گیا جو انہوں نے اپنی پیش رو تہذیب کے ساتھ روا رکھا تھا۔ مسلمانوں کے علمی ذخائر کو ایک طرف تباہ کیا گیا تو دوسری طرف جب مغرب نے مسلم ممالک پر سیاسی تسلط قائم کیا اُس وقت مسلمانوں کے نام کو علوم وفنون کی تاریخ سے ہٹانے کے لئے منظم کوششیں کیں' لیکن ان تمام تر کوششوں کے باوجود خود مستشرقین ہی اس بات کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مسلمانوں نے علوم وفنون کے جو چراغ روشن کئے وہ موجودہ تہذیب کو جنم دینے کا باعث بنے۔ ولیم آسلر (Willium Oslar) لکھتے ہیں :

The Arabian lit a brilliant torch from Grecian lamps and from the eights to the eleventh centuries the profession reached among them a position of dignity and importance to which it is hard to find a parallel in history. (*Willium Oslar, The Evolution of Modern Medicine*)

"عربوں نے یونان کے چراغوں سے ایک مشعل روشن کی اور آٹھویں سے گیارھویں صدی تک علوم وحکمت کا یہ کام ایک ایسے باعظمت اور اہم مقام تک پہنچ گیا کہ پوری تاریخ سے اس کے مقابلے میں کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔"

اِس مضمون میں ہم زیادہ تر مستشرقین ہی کے اقوال سے یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں ہی کی وجہ سے سائنس کو یہ عروج حاصل ہوا ہے۔ اور اگرچہ مسلمانوں نے یونانی سائنسی علوم سے استفادہ کیا تھا' تاہم انہوں نے اس ورثے کو بام عروج تک پہنچا کر افکار وعلوم کی تاریخ میں نمایاں اور شاندار کردار سرانجام دیا تھا۔ مغرب کے اہل علم اب اس بات کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ افکار وعلوم کے حوالے سے مسلمانوں کا دور' زریں

دور تھا۔ بغداد' قاہرہ اور سپین نے وہ کارنامے سرانجام دیئے کہ دنیا آج بھی انہیں یاد کرتی ہے۔ Hoffman لکھتے ہیں :

Spain saw a golden age which can match its turrets with the pilasters of pericles. {*Dr. Ameen Khairullah, Arabian contribution to Medicine P.26*}

"سپین نے ایک سنہری دور دیکھا جس کے آگے قدیم یونان کی شان و شوکت ماند پڑ گئی۔"

Homboldt لکھتے ہیں :

The Arabs were admirably situated to act the part of mediators and to infulence the nations from the Euphrates to the Guadilquivir and Mid-Africa. Their unexampled intellectual activity mark a distinct epoch in the history of the world.{*p.9*}

"اہل عرب بجا طور پر ان تمام قوموں کے لئے جو دریائے یوفریٹس' گاڈل کیوراور وسطی افریقہ کے درمیان آباد تھیں' نہ صرف نگران کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ وہ علمی و تہذیبی طور پر ان کو متاثر بھی کر سکتے تھے۔ ان کی بے مثال علمی سرگرمیاں تاریخ عالم میں ممتاز مقام رکھتی ہیں۔"

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ سلطنتیں اپنے عروج کے زمانے میں عیش و عشرت میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ ہوس ملک گیری کے تحت سلطنتیں تاراج ہوتی ہیں۔ مسلم خلفاء نے' مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز کئے بغیر علم و حکمت کے ساتھ ایک یادگار شغف کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اہل علم کی سرپرستی کی۔ اگر یہ کہا جائے کہ مسلمانوں کی علم و حکمت کے خدمات میں غالب ہاتھ خلفائے اسلام کا ہے تو یہ بات بے جا نہ ہوگی۔ Bayard Dodge جو امریکی یونیورسٹی بیروت کے صدر تھے' لکھتے ہیں :

The love of learning and quest of truth of the great caliphs form an example for every educated man and woman to take heart. {*P.9*}

"مسلمان خلفاء کی علم سے محبت اور حقیقت کی تلاش کے شوق نے تمام پڑھے لکھے مردوں اور عورتوں کے لئے ایک مثال قائم کر دی کہ وہ ہمت اور حوصلہ

حاصل کریں۔"

اسی سلسلے میں ایک اور مستشرق John Davenport لکھتے ہیں :

"عباسی خلفاء علوم اور سائنس کی سرپرستی میں سبقت لے گئے۔ ہارون الرشید یورپ میں خوب جانا پہچانا جاتا ہے۔ سائنس اور علوم کی حوصلہ افزائی میں بجا طور پر یورپ میں اس کی تعریف کی جاتی ہے۔"

عباسیوں کی علم و فن کی سرپرستی کا ذکر کرنے کے بعد مستشرق مذکور لکھتے ہیں :

Such were the brilliant lights which were shed from the Arabian schools from the ninth to fourteenth century. {John Davenport, Mohammad and the Teachniqs of the Qur'an. P.55}

"یہی وہ روشنیاں تھیں جو نویں سے چودھویں صدی تک مسلمان اہل علم نے پھیلائیں۔"

مستشرق موصوف نے سپین میں بھی مسلمان خلفاء کی علمی سرپرستی اور شغف کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ان میں عبدالرحمٰن ثانی اور عبدالرحمٰن ثالث کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ Davenport لکھتے ہیں کہ "اُس وقت جبکہ مسلمان اندلس میں علمی سرگرمیوں میں مصروف تھے اس وقت یورپ مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے اس پہلو سے روشنی ڈالی ہے کہ بصرہ اور بغداد کے مقابلے میں سپین کے علمی مراکز نے یورپ پر جلدی اثر ڈالا کیونکہ سپین' یورپ سے قریب تھا اور یہاں کے طلبہ اور سیاح آسانی سے سپین کے علمی مراکز سے مستفید ہو سکتے تھے"۔ (ایضاً)

حقائق کا انکار کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مستشرقین نے اب اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ یورپ کی تحریک احیائے علوم مسلمانوں ہی کی مرہون منت ہے۔ جان ڈیون پورٹ (John Davenport) لکھتے ہیں :

"دسویں صدی عیسوی میں ہم غیر مسلم' مسلمانوں کے بارے میں بڑے اندھیرے میں رہے ہیں۔ خصوصاً علوم میں ان کی خدمات کے بارے میں ہم نے آنکھیں بند رکھی ہیں۔ ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ ہر قسم کا علم جو آج یورپ میں موجود ہے' خواہ اس کا تعلق طبیعات سے ہو یا فلکیات سے' فلسفہ سے ہو یا ریاضی

سے' وہ عربوں کے مدارس ہی کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں اور سپین کے عرب تو بطور خاص یورپی فلسفے کے آباء واجداد کہلا سکتے ہیں۔" (ایضاً)

ایک اور جگہ Davenport اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ عیسائی ہمیشہ سے مسلمانوں کے بارے میں متعصب رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

Who has not blushed to see a Christian priesthood goading on the civil power to treat with unexampled bigotry and devilish crulty a people from whom they had always received humanity and protection.{p.59}

"کس شخص نے عیسائی مشنریوں پر' ایک ایسی قوم کے خلاف' جس سے عیسائیوں نے ہمیشہ انسانیت اور تحفظ حاصل کیا' ناقابل مثال تعصب اور شیطانی سفاکی پر اکساتے ہوئے ماتم نہ کیا ہوگا۔"

Davenport کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ مغرب راجر بیکن کو سائنسی علوم کا باوا آدم سمجھتا ہے۔ اور راجر بیکن کے تمام افکار و نظریات اور اس کی خدمات مسلمانوں ہی کی مرہون منت ہیں۔ مستشرق موصوف نے فرائر بیکن (Friar Bacon) کا قول نقل کیا ہے کہ "ہم نے (اہل مغرب نے) وسیع علوم مسلمان مصنفین ہی کے ذریعے حاصل کئے ہیں۔" Davenport لکھتے ہیں کہ فرائر بیکن نے کئی ایک مسلمان سائنس دانوں' جن میں ثابت بن قرہ الکندی شامل ہیں' کے حوالے پیش کئے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ فرائر بیکن ان مسلمان سائنس دانوں سے اتنا ہی واقف تھا جتنا کہ وہ قدیم یونانی اور اطالوی سائنس دانوں سے۔ خصوصاً وہ (فرائر بیکن) ابن سینا کا ذکر کرتا ہے اور اسے فلسفے کا سرخیل اور بادشاہ کہتا ہے۔ Davenport لکھتے ہیں :

"یہ مسلّمہ امر ہے کہ لارڈ بیکن نے اپنے تجرباتی فلسفے (Experimental Philosophy) کے بنیادی اصول راجر بیکن سے حاصل کئے تھے اور یہ ایک غیر متنازعہ حقیقت ہے کہ راجر بیکن کا سارا فلسفہ محمدؐ کے پیروکاروں سے اخذ شدہ ہے۔" (ص ۵۹)

گویا کہ مغرب کے سائنس کے سب سے بڑے امام کے نظریات مسلمانوں ہی سے اخذ شدہ تھے۔ وہ مستشرقین جنہوں نے مسلمانوں کے احسان کو کھلے دل سے تسلیم کیا ہے

ان میں ایک رابرٹ بریفالٹ بھی ہیں۔ بریفالٹ لکھتے ہیں :

The light from which civilization was once more re-kindled did not come from the Northern, but from the Southern invdlers of the empire, from the Muslim Arabs. {Robert Brefault, the Making of Humanity, P.188}

"وہ روشنی جس سے تہذیب دوبارہ روشن ہوئی وہ شمال سے نہیں بلکہ جنوب سے مسلمان عرب حملہ آوروں کے ذریعے سے آئی۔"

ایک اور جگہ پر بریفالٹ لکھتے ہیں :

"یورپ کی حقیقی نشاۃ ثانیہ پندرھویں صدی میں نہیں بلکہ عربوں اور موروں کی احیائے ثقافت کے زیر اثر وجود میں آئی۔ یورپ کی نئی پیدائش کا گہوارہ اٹلی نہیں ہسپانیہ تھا۔ براعظم یورپ بربریت کے گڑھوں میں گرتے گرتے جہالت و تنزل کی تاریک ترین گہرائیوں میں پہنچ چکا تھا' حالانکہ اسی زمانے میں عرب دنیا کے شہر' بغداد' قاہرہ' قرطبہ اور طلیطلہ تہذیب اور ذہنی سرگرمیوں کے روز افزوں مرکز بن چکے تھے' وہیں سے وہ زندگی نمودار ہوئی جسے آئندہ چل کر انسانی ارتقاء کی ایک نئی منزل کی شکل اختیار کرنی تھی۔ جب اس تہذیب کے اثرات محسوس کئے جانے لگے عین اسی وقت ایک نئی زندگی کی حرکت یعنی یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔" (ص ۱۸۸)

اسی پہلو پر ڈاکٹر امین خیر اللہ لکھتے ہیں :

"جب مسلمان اپنے عروج کی انتہا پر تھے اس وقت یورپین تاریکی کی انتہا میں تھے۔ علم کا حصول مذہبی یا اونچے درجے کے لوگوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ طب کا علم محض مذہبی پیشواؤں کے ہاتھوں میں تھا۔ یہ لوگ اکثر وقتی مفادات' تعویزوں اور غیر قانونی حرکات کے لئے اپنے فن کو استعمال کرتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات تو کلیسا کو ان لوگوں کی غلط حرکات کو روکنے کے لئے احکام نافذ کرنے پڑتے تھے۔ شمال کی جانب سے آنے والے بربروں سے روم کی تباہی' پے در پے یورپ میں پھیلنے والی وبائیں جنہوں نے یورپ میں تباہی پھیلا دی' یہ سب چیزیں یورپ میں جمود کا باعث بن گئی تھیں۔ اس جمود نے یونان کے سارے علمی ورثے

کے چراغ کو گل کر کے رکھ دیا۔ جب ہارون الرشید اور مامون الرشید اس کوشش میں تھے کہ وہ ہر ایک کے لئے علم مہیا کریں' اس وقت فرانس کے شارلیمان' اس کی بیگمات اور اس کے درباری مشکل سے ہی اپنا نام لکھ سکتے تھے۔ اس وقت سپین عبدالرحمان ثانی اور عبدالرحمن ثالث کی حکومت کے تحت اپنے سنہری دور سے گزر رہا تھا۔ جب لندن کی گلیاں کچی تھیں اور روشنی سے محروم تھیں' جب برطانیہ کے اکثر گھروں میں گھڑیاں نہیں تھیں' اس وقت قرطبہ کو فخر حاصل تھا کہ اس میں ۲۰,۰۰۰ مکانات تھے' میلوں لمبی گلیاں تھیں جو پختہ اور روشنی سے جگمگاتی تھیں۔ اس میں ۳۰۰ مساجد تھیں۔ پچاس ہسپتال تھے۔ ایک لائبریری تھی جس میں ۲۵۰,۰۰۰ کتابیں تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت قرطبہ میں بارہ سال کا کوئی بچہ ایسا نہیں ہوتا تھا جو پڑھ لکھ نہ سکتا ہو۔" (ہسٹری آف میڈیسن' ص۲۶)

John Davenport کے الفاظ خاص طور پر قابل ذکر ہیں جب وہ لکھتے ہیں کہ "یورپ کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ محمد (ﷺ) کے زیر بار ہیں کہ انہوں نے قدیم اور جدید لٹریچر کے درمیان رابطے کا کام کیا۔ یورپ کے طویل دور تاریک میں انہوں نے بہت سے عظیم فلسفیوں کے افکار کو محفوظ کیا۔ اور سائنس کی نہایت اہم شاخیں' ریاضیات اور طب وغیرہ' مسلمانوں ہی کی ممنون احسان ہیں.... قدیم یا بعد کے زمانوں میں کوئی بھی قوم ایسی موجود نہیں رہی ہے جس نے علوم میں گہرائی حاصل کرنے کے لئے اتنی محنت اور شوق کا مظاہرہ کیا ہو جتنا عربوں نے ـــــ سپین اور قاہرہ اُس دور کی علمی نرسریاں تھیں۔ وہ قوم جو بربریت کی حالت میں تھی اب وہ ابن سینا' ابن رشد' ابن بیطار' ابو طفیل اور اس جیسے دیگر لوگوں کے افکار کو نئے نئے اسالیب دے رہی تھی۔ نہ صرف یہ عہد اسلام کا زریں عہد تھا بلکہ اسلام تو اپنے آغاز ہی سے علم کے لئے بڑا سازگار تھا"۔ (محمدؐ اور تعلیمات قرآنی' ص۵۷)

C.G.Comston اپنی کتاب The History of Medicine میں لکھتے ہیں

Never shall the world see again so marvellous a sight as the Arabs afforded during the ninth century.

These pastoral people whom religious anthusiasm had suddenly made masters of half the civilized world set to work to study science. During this time Germanic hords prided themselves upon their brutal ignorance and it took them several centuries to link up the chain of tradition, while the Arabian accomplished in one century. {*Dr. Ameen Khairullah, Arabian contribution to Medicine P.187*}

"دنیا پھر دوبارہ اس حیران کن روشنی کو کبھی نہیں دیکھ سکے گی جو مسلمانوں نے نویں صدی عیسوی میں مہیا کی۔ اس چرواہوں کی قوم کو ان کے مذہبی جوش و خروش نے انتہائی سرعت کے ساتھ آدھی دنیا کی تہذیب کا استاد بنا دیا اور انہیں سائنسی علوم کے مطالعے میں لگا دیا۔ اسی دوران جب جرمن اقوام اپنی وحشیانہ جہالت پر ناز کرتی تھیں اور انہیں علوم و فنون اور تہذیبی تسلسل کے ساتھ کوئی تعلق قائم کرنے میں کئی صدیاں لگ گئیں جبکہ یہی کام مسلمانوں نے صرف ایک ہی صدی کے اندر سرانجام دے دیا۔"

معتدل مستشرقین اس حقیقت کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ سائنس کو اس کی حقیقی روح سے مسلمانوں نے ہی متعارف کروایا۔ رابرٹ بریفالٹ لکھتے ہیں :

The Greeks in short, had no science, and no scientific spirit. It is science and the scientific spirit which constitute the distinction between the ancient and the modern world. The Greeco-Roman civilization remained prescientific. {*Robert Brefault, the Making of Humanity, P.150*}

"مختصر یہ کہ اہل یونان' سائنس یا کسی سائنسی روح سے متعارف نہیں تھے۔ یہی سائنس اور سائنسی روح تھی جس نے قدیم اور جدید دنیا کے درمیان فرق و امتیاز پیدا کیا۔ (سائنس کی اصل روح سے مسلمانوں نے ہی متعارف کروایا۔) اس اعتبار سے یونانی اور رومی تہذیب قبل از سائنس کی تہذیب ہے"۔

آگے چل کر بریفالٹ مزید لکھتے ہیں :

In short, what we call science arose in Europe as a

result of a new spirit of inquiry, of new methods of investigation, of the method of experiment, observation, measurement, of the development of mathematics in a form unknown to Greeks. That spirit and those methods were introduced in to the European world by the Arabs. {P.191}

"مختصر یہ کہ ہم جس چیز کو سائنس کہتے ہیں جو یورپ میں' جستجو کی نئی روح' تحقیقات کے جدید طریقوں' تجربات کے نئے نئے اندازوں' مشاہدات' پیائش اور ریاضی کی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہوئی' اس سے یونانی واقف نہ تھے' اس (سائنسی) روح اور (تجربات کے) جدید طریقوں سے اہل یورپ' عربوں ہی کے ذریعے متعارف ہوئے تھے۔)"

یہی مستشرق لکھتے ہیں :

"ہماری سائنس پر عربوں کا جو احسان ہے وہ چونکا دینے والے اکتشافات یا انقلابی نظریات پر مشتمل نہیں بلکہ سائنس اس سے بھی زیادہ عربی ثقافت کی ممنون ہے"۔ (ص ۲۹٦)

اِسی مستشرق کا یہ بیان مسلمانوں کی سائنسی خدمات کو بہت بڑا خراج تحسین ہے کہ

"اغلب خیال یہی ہے کہ اگر عرب نہ ہوتے تو زمانہ حاضر کی یورپی تہذیب ایسی نوعیت اختیار نہ کر سکتی جن کی وجہ سے وہ ارتقاء کی تمام ماقبل منزلوں سے آگے بڑھ گئی ہے"۔ (ص ۲۹۴)

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک فکر انگیز خطاب

عظمت قرآن

بزبان قرآن و صاحبِ قرآن

صفحات ۲۸' قیمت (عام ایڈیشن) ۔/۴ روپے' (اعلیٰ ایڈیشن) ۔/۷ روپے

سیرت وسوانح

مولانا عبدُالسّلام ندوی

عبدالرشید عراقی

دبستانِ شبلی میں مولانا عبدالسلام ندوی کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے جو اہلِ علم و قلم تیار کئے ان میں مولانا سید سلیمان ندوی کے بعد مولانا عبدالسلام ایک ممتاز عالم دین تھے۔ ان کو تمام علوم اسلامیہ میں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ مولانا عبدالسلام ندوی ایک جید عالم دین' محقق' مؤرخ' ادیب' انشاپرداز' نقاد' محدث' فقیہ' متکلم اور فلسفی تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب مصنف بھی تھے۔ آپ نے تفسیر' حدیث' فقہ' تاریخ' سیرت' علم کلام' فلسفہ' منطق' ادب و شعر' نفسیات اور اجتماعیات پر بے شمار علمی و تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھے جو الندوہ لکھنؤ' الہلال کلکتہ اور معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوئے۔

مولانا عبدالسلام ندوی کا حافظہ بہت قوی تھا۔ ٹھوس اور قیمتی مطالعہ ان کا سرمایہ علم تھا۔ اپنے حافظہ کی بنا پر جو لکھتے اس میں قطع و برید اور ترمیم و اضافہ کی کوئی ضرورت نہ ہوتی اور آپ نے کہیں بھی اپنی تحریروں پر نظرثانی نہیں کی۔

مولانا عبدالسلام ندوی علامہ سید سلیمان ندوی کے دست راست تھے۔ ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے وابستہ ہوئے اور اپنی زندگی دارالمصنفین میں ہی گزار دی۔ ۱۹۵۶ء میں ان کا انتقال ہوا اور دارالمصنفین کے قبرستان میں مولانا شبلی کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ مولانا عبدالسلام ندوی' مولانا شبلی کے خاص تلامذہ میں سے تھے۔ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی لکھتے ہیں :

> "عبدالسلام ندوی دبستان شبلی کے گل سرسبد تھے۔ انہوں نے مختلف علمی و مذہبی موضوعات پر کثرت سے کتابیں اور مضامین لکھے ہیں۔ لیکن ان کا خاص موضوع

شعر و ادب تھا۔ اس کے وہ نکتہ سنج ناقد بھی تھے اور دیدہ ور محقق و مورخ بھی' خالص ادبی موضوعات پر ان کی کتابوں شعر الہند' اقبال کامل اور مقالات عبدالسلام کو شہرت و مقبولیت کی دنیا میں کلاسکس کا درجہ مل چکا ہے۔ شعر الہند اردو اصناف سخن کی تاریخ اور شعرائے اردو کا تذکرہ ہے۔ عبدالسلام شبلی اسکول کے ادیبوں میں اسلوب شبلی کے سب سے کامیاب مقلد تھے۔"

(علامہ سید سلیمان ندوی' شخصیت و ادبی خدمات صفحہ ۶۲۔۶۳)

پروفیسر محمد الیاس الاعظمی ریسرچ اسکالر شبلی کالج اعظم گڑھ لکھتے ہیں :

"علامہ شبلی نعمانی نے نامورانِ علم و فن کا جو کارواں اپنے پیچھے چھوڑا تھا مولانا عبدالسلام ندوی اس کے رکن اعظم تھے۔ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے رفیق کار' علامہ سید سلیمان ندوی کے دست راست اور دارالمصنفین کے بانیوں میں سے تھے۔ مدۃ العمر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ اسوۂ صحابہ و صحابیات' تاریخ اخلاق اسلامی' سیرت عمر بن عبدالعزیز' شعر الہند' اور اقبال کامل جیسی معرکہ آراء کتابیں لکھیں۔ سیرت النبیؐ کی تالیف میں بھی حصہ لیا۔ اس کے علاوہ اہم علمی کتابوں کا ترجمہ کیا اور مختلف موضوعات پر بہت سارے مضامین و مقالات لکھے۔" (سہ ماہی "فکر و نظر" اسلام آباد' جلد ۳۳' شمارہ نمبر ۱' صفحہ ۶۹)

مولانا عبدالسلام ندوی ۱۸۸۲ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک قصبہ پٹی علاؤالدین میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ کے اساتذہ و علماء سے حاصل کی۔ اس کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے اور ندوۃ العلماء میں مولانا سید علی زینبی' مولانا حفیظ اللہ اعظمی' اور مولانا شبلی بن محمد علی جیراج پوری سے جملہ علوم اسلامیہ میں تحصیل کی۔ مولانا حکیم سید عبدالحی الحسنیؒ لکھتے ہیں :

"ولد ونشا بقريه "پٹو" من اعمال اعظم گڑھ و اشتغل بالعلم زمانا على اساتذة بلادہٖ' ثم قدم لكهنو و قرأ على السيد على الزبينى و المولوى شبلى بن محمد على و المولوى حفيظ الله وعلى خيره من الاساتذة بدار العلوم"۔

(نزھۃ الخواطر ج ۸' ص ۲۵۳)

تکمیل تعلیم

۱۹۱۰ء میں مولانا عبدالسلام ندوی نے ندوۃ العلماء میں تکمیل تعلیم کی اور اس کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے جو اُس وقت ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم تھے' ان کو ندوۃ میں ادب کا استاد مقرر کر دیا اور اس کے ساتھ ندوۃ العلماء کے آرگن الندوہ کے سب ایڈیٹر بھی ہو گئے۔ آپ "الندوہ" کے سب ایڈیٹر مارچ ۱۹۱۰ء تا اپریل ۱۹۱۱ء تک رہے۔ اور اس زمانہ میں آپ نے کئی علمی و تحقیقی' مذہبی و تاریخی اور تنقیدی مضامین "الندوہ" میں لکھے۔

الہلال کے عملہ ادارت میں

۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے ہفتہ وار الہلال جاری کیا تو مولانا عبدالسلام ندوی الہلال کے عملہ ادارت میں شامل ہو گئے۔ الہلال میں آپ نے کئی علمی و تحقیقی مضامین لکھے۔ الہلال میں مضمون نگاروں کے نام نہیں چھپتے تھے۔ اس لئے اب یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ الہلال میں ان کی تحریریں کون کون سی ہیں۔ مولانا محمد نعیم صدیقی ندوی نے لکھا ہے کہ "الحرب فی الاسلام" مضمون مولانا عبدالسلام ندوی کا تھا۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ میں

۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی نعمانی نے دارالمصنفین کا خاکہ مرتب کیا' جس کی عمارت کے لئے اپنا آبائی باغ وقف کر دیا۔ مگر ابھی باقاعدہ طور پر دارالمصنفین کی بنیاد نہیں پڑی تھی کہ ۱۸/ ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۸/ نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی کا انتقال ہو گیا۔ مولانا شبلی نے اپنے انتقال سے پہلے اپنے ادھورے علمی کاموں کی تکمیل کے لئے اپنے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندوی کو وصیت کی تھی کہ میرے ادھورے علمی کام کی تکمیل کی جائے۔ ان میں دارالمصنفین کا قیام اور سیرت النبی ﷺ کی تکمیل سرفہرست تھی۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی کے ہاتھوں مئی ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین کا قیام عمل میں آیا اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تکمیل ہوئی۔

مولانا عبدالسلام ندوی اُن دنوں کلکتہ میں مقیم تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے انہیں کلکتہ سے بلالیا اور وہ دار المصنفین سے وابستہ ہوگئے اور اپنی ساری زندگی دار المصنفین ہی میں بسر کردی۔

مولانا سید عبدالحی الحسنی لکھتے ہیں :

"ثم سار الی العظم گڑھ وصار رفیقًا مِن رفقاءِ دار المصنفین۔" (نزھۃ الخواطر : ج ۸' ص ۳۵۳)

مولانا عبدالسلام ندوی کا علمی تبحّر

مولانا عبدالسلام ندوی جملہ علوم اسلامیہ کے متبحر عالم تھے۔ تفسیر' حدیث' فقہ' تاریخ' علم کلام' فلسفہ' منطق میں ان کو مکمل دسترس حاصل تھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی لکھتے ہیں :

"مولانا عبدالسلام ندوی فطری مصنف اور انشاء پرداز تھے۔ قوتِ آخذہ بڑی تیز تھی۔ سرسری مطالعہ سے کتابوں کا جوہر کھینچ لیتے تھے۔ قلم برداشتہ لکھتے تھے اور اس پر نظر ثانی اور حک و اصلاح کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی۔ ان کا مسودہ اولیٰ ہی مبیّضہ ہوتا تھا"۔ (تذکرہ علمائے اعظم گڑھ' ص ۱۶۰)

مولانا عبدالسلام ندوی کا مسلک

مولانا عبدالسلام ندوی نے ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ میں حاصل کی تھی۔ کانپور' آگرہ اور مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں اکتساب فیض حاصل کیا تھا اور اسکے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ سے تکمیل کی۔ مولانا عبدالسلام ندوی' مولانا شبلی نعمانی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں :

"کان من کبار تلامیذ العلامہ شبلی بن حبیب اللہ الندوی۔"

مولانا شبلی حنفی المسلک تھے مگر مولانا عبدالسلام ندوی سلفی العقیدہ اہلحدیث مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ ان پر استاد کا یہ رنگ غالب نہیں آیا۔

مولانا ابو علی اثری (سابق رفیق اعظم گڑھ) لکھتے ہیں :

"مولانا عبد السلام ندوی خاندانی اہلحدیث تھے۔ ان کی شادی بھی چاندپارے کے ایک اہلحدیث خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کے خسر جن کی زیارت کا شرف راقم السطور کو حاصل ہے' مذہب اہلحدیث کے ایک اچھے اور ممتاز عالم تھے۔ اس دیار کے مشہور اہلحدیث عالم مولانا سلامت اللہ جیراج پوری سے بھی ان کی قرابت تھی۔ وہ خود بھی اسی مسلک کے تھے۔ سینے پر ہاتھ باندھتے تھے۔ اہل حدیثوں کے مسلک کے مطابق ۸ رکعت تراویح کے قائل تھے اور اسی کو صحیح سمجھتے تھے اور اسی پر ان کا عمل بھی تھا۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں ہوئی تھی۔ یہاں کے تعلیمی اسٹاف میں اہلحدیث اساتذہ بھی تھے۔ ندوہ میں مولانا شبلی کی ترغیب سے آئے اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کی بدولت بہت جلد مولانا شبلی کے مقرب بارگاہ ہو گئے۔ لیکن اس تقرب و اختصاص کے باوجود انہوں نے مولانا شبلی کا مسلکی اثر قبول نہیں کیا۔ سید سلیمان ندوی جس مسئلے میں بھی ان سے تبادلہ خیالات فرماتے تھے اس میں ہمیشہ اہلحدیث مسلک ہی کے مطابق رائے دیتے تھے۔"

(چند رجال اہلحدیث صفحہ ۹۷)

اخلاق و اوصاف

مولانا عبد السلام ندوی بہت سادہ مزاج تھے۔ نام و نمود کی طلب کا تصور بھی ان کے دماغ میں نہ تھا۔ پوری زندگی قناعت اور شان استغناء کے ساتھ دار المصنفین اعظم گڑھ میں گزاری۔ مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی لکھتے ہیں :

"مولانا عبد السلام ندوی تحمل' بردباری اور انکساری کے پیکر تھے۔ اس قدر سادہ لوح اور بے تکلف تھے کہ چھوٹے بڑے' ادنیٰ اعلیٰ ہر شخص سے ایک طرح سے ملتے تھے اور ادنیٰ ملازمین تک ان سے بے تکلف تھے۔ باتیں ایسی معصوم اور بھولی کرتے تھے کہ ناواقف آدمی ان کو بہ مشکل پڑھا لکھا تصور کر سکتا تھا۔ جو لوگ ان کی تصانیف کے ذریعے انہیں جانتے تھے ان سے ملنے کے بعد ان کے مصنف ہونے کا یقین نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا پورا اثاثہ دار المصنفین کی ۴۵ سالہ زندگی کا حاصل چند جوڑے کپڑے' ۲ بکس' ایک پلنگ اور ایک بستر سے زیادہ نہ تھا۔"

(تذکرہ علمائے اعظم گڑھ' ص ۱۶۱)

وفات

مولانا عبدالسلام ندوی نے ۲۸ صفر ۱۳۷۶ھ (۴/ اکتوبر ۱۹۵۶ء) دارالمصنفین اعظم گڑھ میں انتقال کیا اور دارالمصنفین کے قبرستان میں مولانا شبلی نعمانی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ (نزہتہ الخواطر' ج ۸' ص ۲۵۲)

مقالات

مولانا عبدالسلام ندوی "الندوہ" لکھنؤ' "الہلال" کلکتہ' اور "معارف" اعظم گڑھ سے وابستہ رہے اور تینوں علمی رسائل میں آپ کے مذہبی' علمی' تحقیقی' ادبی' تاریخی اور تنقیدی مقالات شائع ہوتے رہے' جن کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے :

"الندوہ" لکھنؤ

"الندوہ" لکھنؤ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا مشہور رسالہ اور اس کا نقیب تھا۔ علامہ شبلی نعمانی کو اس کی اشاعت کا خیال ۱۹۰۲ء میں آیا' لیکن اس کا پہلا شمارہ اگست ۱۹۰۴ء میں منصہ شہود پر جلوہ گر ہوا' اور ۱۹۱۶ء تک جاری رہا۔ الندوہ کے پہلے ایڈیٹر مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی اور علامہ شبلی نعمانی مقرر ہوئے۔ مولانا عبدالسلام ندوی مارچ ۱۹۱۰ء تا اپریل ۱۹۱۱ء اس کے نائب ایڈیٹر رہے۔

"الندوہ" کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بے شمار اہل علم و قلم پیدا کئے' جن کے علمی کارنامے برصغیر کی علمی و ادبی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا سید سلیمان ندوی' مولانا عبدالسلام ندوی' مولانا عبداللہ العمادی اور مولانا عبدالواحد ندوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان سب کی علمی و قلمی نشوونما الندوہ کے زیر سایہ ہوئی۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے الندوہ لکھنؤ میں ۲۹ مقالات لکھے۔ یہ مقالات' مذاہب' قرآنیات' حدیث' تاریخ اسلام' تصوف' فلسفہ و کلام' تعلیمات اور تذکرہ سے متعلق ہیں۔ یہاں صرف ۲۰ مقالات کا ذکر کیا جاتا ہے :

مذاہب	۱) مذاہب — تاریخ	مئی' جون ۱۹۰۶ء (پہلا مضمون)
	۲) اسلام' عیسائی ممالک میں	اپریل ۱۹۱۰ء
	۳) تحقیق مذہب و سائنس	جون ۱۹۱۰ء
قرآنیات	۴) زکوٰۃ	اکتوبر ۱۹۰۸ء
	۵) قصص الانبیاء اور قرآن مجید	ستمبر ۱۹۰۹ء
حدیث	۶) صحیح مسلم	جنوری ۱۹۰۶ء
تاریخ اسلام	۷) قسطنطنیہ کے کتب خانے	مارچ ۱۹۱۰ء
	۸) مسلمانوں کی جغرافیانہ خدمات	مئی ۱۹۱۰ء
	۹) العرب قبل الاسلام	نومبر ۱۹۱۰ء
تصوف	۱۰) رہبانیت اور اسلام	اپریل ۱۹۰۹ء
	۱۱) بدعت	نومبر' دسمبر ۱۹۱۱ء
فلسفہ و کلام	۱۲) فلسفہ شیخ الاشراق	مارچ ۱۹۱۰ء
	۱۳) مذہب اور عقل	اکتوبر ۱۹۱۰ء
	۱۴) مذہب اسلام اور علم و عقل	جولائی ۱۹۱۱ء
	۱۵) مسئلہ ارتقاء	ستمبر' اکتوبر ۱۹۱۱ء
تعلیمات	۱۶) قدیم عربی مدارس کی اصلاح ترکی میں	جولائی ۱۹۱۰ء
	۱۷) اندھوں کی تعلیم	جولائی ۱۹۱۱ء
تذکرہ	۱۸) امام مسلمؒ	دسمبر ۱۹۰۶ء
	۱۹) حضرت عبداللہ بن عمرؓ	ستمبر ۱۹۱۰ء
	۲۰) حضرت سلمان فارسی	اکتوبر ۱۹۱۰ء

"الہلال" کلکتہ

مولانا ابوالکلام آزاد کا شہرۂ آفاق ہفت روزہ "الہلال" برصغیر کا ایک مشہور علمی' تحقیقی' دینی اور سیاسی اخبار تھا۔ اور یہ اخبار صحیح معنوں میں برصغیر کی سیاسی' صحافتی اور ادبی تاریخ میں سنگ میل ثابت ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی عہد آفرین شہرت و عظمت کا

سہرا مولانا ابوالکلام آزاد کی نابغہ شخصیت کے سر ہے' لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ الہلال کو بدر کامل بنانے میں ان اہل علم و صاحب علم و فضل کا بڑا نمایاں حصہ ہے جو اس کے عملہ ادارت میں شامل تھے۔ اس کا اندازہ درج ذیل فہرست سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی' مولانا عبدالسلام ندوی' خواجہ عبدالواحد ندوی' مولانا عبداللہ العمادی اور مولانا حامد علی صدیقی' الہلال کا تنوع مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ ساتھ ان ممتاز اہل علم کا رہین منت ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں :

"روزنامہ کے لئے نہیں ایک ہفتہ وار کے لئے اتنا بڑا اور ایسا کھرا سٹاف اردو صحافت کی تاریخ میں کسی اور کو کیوں نصیب ہوا ہو گا"۔

(سہ ماہی صبح دہلی' ابوالکلام نمبر ص ۴۸)

مالک رام لکھتے ہیں :

"الہلال کے تمام کارناموں سے قطع نظر اس کی اہمیت اور معیار کا اندازہ لگانے کے لئے صرف اس کا حیرت انگیز ادارہ تحریر ہی کافی ہے جو ملک کے صف اول کے ادیبوں اور انشاپردازوں پر مشتمل تھا۔ ہفتہ وار تو درکنار کسی اردو ماہنامے کو بھی آج تک ایسا شاندار ایڈیٹوریل سٹاف نہ ملا ہو گا"۔

(سہ ماہی صبح دہلی' ابوالکلام نمبر' ص ۵۸)

الہلال میں مضمون نگاروں کے نام شائع نہیں ہوتے تھے اس لئے یہ پتہ لگانا بہت دشوار ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی نے الہلال میں کتنے اور کون کون سے مضامین لکھے حالانکہ مولانا شبلی نعمانی نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ اپنا نام لکھا کرو' جیسا کہ مولانا شبلی نعمانی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"تمہارے مضامین الہلال میں دیکھتا ہوں' مولوی ابوالکلام صاحب اجازت دیں تو نام لکھا کرو' ایسے مضامین گمنام ٹھیک نہیں' اس سے کیا فائدہ کہ ایک شخص کی زندگی گم ہو جائے"۔ (مکاتیب شبلی' ج ۲' ص ۱۷۹)

الہلال کا پہلا شمارہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو منصہ شہود پر آیا۔ الحرب فی الاسلام' جو الہلال کی کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ مولانا عبدالسلام ندوی کا مضمون تھا۔

(سید سلیمان ندوی' شخصیت و ادبی خدمات' ص ۳۵۱)

معارف اعظم گڑھ

ماہنامہ "معارف" دارالمصنفین کا آرگن ہے۔ یہ ایک علمی و تحقیقی و ادبی رسالہ ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اس رسالہ کو ایک خاص امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یہ رسالہ علامہ سید سلیمان ندوی کے زیر ادارت جولائی ۱۹۱۶ء میں جاری ہوا۔ دارالمصنفین مئی ۱۹۱۵ء میں قائم ہوا تھا۔ مولانا عبدالسلام ندوی کلکتہ میں مقیم تھے۔ ان کو علامہ سید سلیمان ندوی نے اعظم گڑھ بلالیا۔ مولانا شاہ معین احمد ندوی لکھتے ہیں :

"مولانا شبلی مرحوم نے اپنے جن تلامذہ کو تالیف و تصنیف کے لئے تیار کیا تھا' ان میں مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نہایت ممتاز تھے۔ وہ الہلال کلکتہ کے عملہ ادارت میں تھے' مگر الہلال بند ہو چکا تھا اور مولانا ابھی تک کلکتہ ہی میں مقیم تھے۔ اس لئے دارالمصنفین کے قیام کے بعد ان کو بلا لیا گیا۔ اور وہ مئی ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین آ گئے"۔ (حیات سلیمان ص ۱۰۰)

مولانا عبدالسلام ندوی مئی ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے اور اپنی ساری زندگی دارالمصنفین میں گزاری۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے معارف میں مختلف موضوعات پر متعدد مضامین و مقالات لکھے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا اس میں قرآن مجید' تفسیر' حدیث' فقہ' تاریخ' سیرت' تصوف' فلسفہ و کلام' شعر و ادب وغیرہ شامل ہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے معارف میں جو علمی' دینی' تحقیقی' تنقیدی' ادبی' تاریخی' مقالات لکھے اگر ان کی مکمل فہرست دی جائے تو مقالہ بہت طویل ہو جائے گا۔ تاہم ان کے چند علمی و تحقیقی مقالات کی فہرست درج ذیل ہے :

مذاہب	۱)	اسلام اور نصرانیت کی کشمکش روس میں	اپریل تا ستمبر ۱۹۱۸ء
	۲)	اسلام اور عیسائیت	فروری' مارچ ۱۹۲۳ء
قرآنیات	۳)	قرآن مجید اور شاعری	جون ۱۹۲۰ء
	۴)	خصائص قرآن مجید	جون ۱۹۳۲ء
	۵)	معجزہ قرآن مجید کی نوعیت کا معنوی پہلو	اکتوبر' نومبر ۱۹۵۰ء
حدیث	۶)	محدثین کرام کے فضائل اخلاق	مارچ ۱۹۱۷ء

	۷) کیا علم حدیث پر سلطنت کا اثر پڑا ہے؟	نومبر ۱۹۲۴ء
فقہ	۸) تحریم سود کے علل و اسباب	جون تا ستمبر ۱۹۲۴ء
	۹) القضاء فی الاسلام	نومبر ۱۹۲۷ء تا فروری ۱۹۲۸ء
	۱۰) مسلمانوں کے چند مخصوص اوقاف	اپریل ۱۹۳۴ء
سیرت	۱۱) معجزات اور اسباب خفیہ	جنوری ۱۹۲۳ء
	۱۲) اجتہادات نبویہ	اپریل ۱۹۲۵ء
	۱۳) اوصاف نبوت اور قرآن مجید	فروری ۱۹۳۰ء
تاریخ اسلام	۱۴) عمارات اسلام ۔ حریم قدس	جولائی تا اکتوبر ۱۹۱۶ء
	۱۵) اسلامی تمدن کی کامیابیاں	اپریل ۱۹۲۰ء
	۱۶) علمائے اسلام کا اخلاق	مئی تا ستمبر ۱۹۴۶ء
	۱۷) اسلامی ہند کے تمدنی کارنامے	اگست تا نومبر ۱۹۴۹ء
تاریخ عام	۱۸) تاریخ اخلاق یورپ	مارچ ۱۹۱۸ء
	۱۹) مسلمانان روس	مئی تا ستمبر ۱۹۱۸ء
تصوف	۲۰) رہبانیت اور اسلام	دسمبر ۱۹۳۳ء' جنوری ۱۹۳۴ء
	۲۱) تصوف کی اجمالی تاریخ	اپریل تا اکتوبر ۱۹۳۵ء
	۲۲) صوفیانہ نظام اخلاق	اکتوبر' نومبر ۱۹۳۷ء
	۲۳) تصوف کی تجدید و اصلاح	مارچ ۱۹۳۸ء
فلسفہ و کلام	۲۴) فلسفہ لیبان	دسمبر ۱۹۱۷' اکتوبر ۱۹۱۸ء تا مئی ۱۹۱۹ء
	۲۵) امام رازی اور تنقید فلسفہ	ستمبر' اکتوبر ۱۹۴۲ء
	۲۶) فلسفہ اشراق اور اسلام	جولائی' اگست ۱۹۴۴ء
	۲۷) یونانی فلسفہ کے تاریخی ماخذ	اپریل تا جون ۱۹۵۲ء
تعلیمات	۲۸) تعلیم و تربیت	جنوری تا جولائی ۱۹۱۷ء
	۲۹) مسئلہ اصلاح تعلیم نفسیاتی اصول پر	اپریل تا جون ۱۹۴۰ء

	۳۰) اسلامی علوم و فنون اور مستشرقین یورپ	دسمبر ۱۹۸۵ء
طب	۳۱) تاریخ طب کے پوشیدہ ورق	جون ۱۹۳۰ء
	۳۲) اسلامی طب کی مختصر تاریخ	جنوری' فروری ۱۹۴۸ء
تذکرہ	۳۳) نواب عماد الملک سید حسن بلگرامی	جون ۱۹۲۶ء
	۳۴) معجم البلدان اور یاقوت حمدی	اکتوبر ۱۹۳۰ء
	۲۵) امام رازی اور ان کی تصنیفات	دسمبر ۱۹۴۰ء
	۳۶) عبداللطیف بغدادی	جون ۱۹۴۴ء
اردو ادب	۳۷) اقبال کا فلسفہ خودی	اپریل تا دسمبر ۱۹۴۷ء
	۳۸) اردو شاعری میں انقلاب کیونکر پیدا ہوا	جولائی' اگست ۱۹۵۶ء
	۳۹) دلی اور لکھنؤ کی شاعری اور ایک کا اثر دوسرے پر	جون تا ستمبر ۱۹۵۶ء
	۴۰) قدیم و جدید شعراء اور ان کی شاعری	جنوری تا اپریل ۱۹۵۸ء
	۴۱) اردو شاعری اور فن تنقید	مئی تا ستمبر ۱۹۵۸ء' اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۱ء' مارچ ۱۹۶۲ء
تنقید و تبصرہ	۴۲) دیوان حسرت موہانی	مارچ' اپریل ۱۹۱۷ء
	۴۳) دیوان فانی بدایونی	جولائی ۱۹۲۲ء
	۴۴) ماثر صدیقی	فروری ۱۹۲۶ء
	۴۵) کلیات اقبال	جون ۱۹۲۶ء
	۴۶) وقار حیات	اگست ۱۹۲۹ء
	۴۷) بہارستان (مولانا ظفر علی خان)	جنوری ۱۹۴۱ء
	۴۸) اردو غزل (یوسف حسین خاں)	مارچ ۱۹۵۴ء

شاعری

مولانا عبدالسلام ندوی شاعر بھی تھے اور شمیم تخلص کرتے تھے۔ ان کی غزلیں معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ ان کی شاعری کی خصوصیت یہ تھی کہ لکھنؤ

کی شاعری کو دلی کی شاعری پر ترجیح دیتے تھے۔ ان کی جو غزلیں معارف میں شائع ہوئیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے :

غزل' معارف۔ اگست ۱۹۱۶ء' اپریل ۱۹۱۹ء' ستمبر ۱۹۱۹ء' دسمبر ۱۹۱۹ء' مارچ ۱۹۲۰ء' فروری ۱۹۲۲ء' جون ۱۹۲۹ء' اکتوبر ۱۹۳۶ء

متفرقات

مولانا عبدالسلام ندوی الندوہ کے سب ایڈیٹر رہے اور معارف سے بھی ان کا تعلق تقریباً ۴۰ سال رہا۔ کبھی کبھی الندوہ اور معارف میں شذرات بھی لکھے' جن کی تفصیل اس طرح ہے :

الندوہ = (شذرات) اپریل' جون' ستمبر' دسمبر ۱۹۱۰ء' مئی ۱۹۱۱ء

معارف = فروری ۱۹۲۵ء' مئی' جون ۱۹۲۶ء' اگست ۱۹۴۲ء

تصانیف

مولانا عبدالسلام ندوی نے جن موضوعات پر کتابی صورت میں قلم اٹھایا' ان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے :

۱) اسوۂ صحابہ (۲ جلد) : جلد اول میں صحابہ کرام و صحابیات رضی اللہ عنہم کے عقائد' عبادات' معاملات' طرز معاشرت' حسن معاشرت اور اخلاق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جلد دوم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی علمی و دینی اور سیاسی کارناموں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

۲) اسوۂ صحابیات : اس کتاب میں اکابر صحابیات رضی اللہ عنہن کے دینی و اخلاقی اور معاشرتی حالات کو سبق آموز انداز میں بیان کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ صحابیات رضی اللہ عنہن کے مذہبی و اخلاقی اور علمی خدمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

۳) اقبال کامل : اس کتاب میں علامہ اقبال کے حالات' سوانح' ان کی تصانیف پر نقد و تبصرہ اور ان کے فلسفہ خودی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں علامہ

اقبال کے نظریہ ملت' تعلیم و سیاست پر تنقیدی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

۴) القضاء فی الاسلام : اس کتاب میں شہادت اور مقدمات کے اسلامی اصول و قوانین کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔

۵) امام رازی : اس کتاب میں امام فخرالدین رازی کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔

۶) تاریخ اخلاق اسلامی (۲ جلد) : اس کتاب میں نبوت سے پہلے عربوں کے اخلاق و کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۷) حکمائے اسلام (۲ جلد) : جلد اول میں فلسفہ یونان کی تاریخ اور اس کے ماخذ' فلسفہ اشراق اور علوم عقلیہ میں مسلمانوں کی اشاعت کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ جلد دوم میں ۴۲ حکمائے اسلام کے حالات زندگی اور ان کی علمی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۸) سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ : اس کتاب میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حالات زندگی اور ان کے علمی کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

۹) شعرالہند (۲ جلد) : جلد اول میں شاعری کی ابتداء سے دور جدید تک کے شعراء کا تذکرہ ہے۔ جلد دوم میں اصناف شاعری یعنی غزل' رباعی وغیرہ پر ادبی اور تاریخی حیثیت سے تبصرہ کیا گیا ہے۔

۱۰) فقرائے اسلام : اس کتاب میں ان علماء کرام کے حالات درج کئے ہیں جنہوں نے صاحب علم و فضل ہونے کے باوجود اپنی زندگی درویشانہ انداز سے گزاری۔

۱۱) شعرالعرب (غیر مطبوعہ) : عرب شعراء کے حالات اور ان کے شاعرانہ کمالات کی تفصیل۔ (سہ ماہی فکر و نظر اسلام آباد ج ۳۳' شمارہ ۱' ص ۸۷)۔

۱۲) حیات شبلی (غیر مطبوعہ) : مولانا شبلی نعمانی کے حالات اور ان کی علمی خدمات کا تذکرہ۔ (سہ ماہی فکر و نظر اسلام آباد' ج ۳۳' شمارہ ۱' ص ۷۶)

۱۳) تاریخ التنقید (غیر مطبوعہ) : (سہ ماہی فکر و نظر اسلام آباد ص ۷۶)

۱۴) ابن یمین : اس کتاب میں ابن یمین کے حالات اور ان کے کلام پر نقد و تبصرہ ہے۔

تراجم

مولانا عبدالسلام ندوی نے جن کتابوں کے اردو میں تراجم کئے' ان کی تفصیل درج ذیل ہے :

۱) ابن خلدون : مصری عالم ڈاکٹر طہ حسین کی عربی کتاب "ابن خلدون" کا ترجمہ' جس میں ابن خلدون کے حالات اور ان کے سیاسی' اقتصادی اور عمرانی نظریات پر روشنی ڈالی گئی۔

۲) انقلاب الامم : مشہور فرانسیسی عالم و مفکر گستاؤلی بان کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ۔

۳) اسلامی قوانین فوجداری : مولانا سلامت علی خاں کی عربی کتاب "کتاب الاختیار" کا اردو ترجمہ۔

۴) التربیہ الاستقلالیہ : یہ کتاب انفونس ایگروس کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں اولاد کی تعلیم و تربیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۵) تاریخ الحرمین الشریفین : علامہ محمد مجیب الشوتی کی کتاب "الرحلہ الحجازیہ" کا اردو ترجمہ۔ اس کتاب میں مکہ مکرمہ' بیت اللہ' حجر اسود' مدینہ منورہ اور مسجد نبوی کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

۶) تاریخ فقہ اسلامی : مصری فاضل محمد خضری کی کتاب "التشریع الاسلامی" کا اردو ترجمہ۔ اس کتاب میں فقہ کی مکمل تاریخ بیان کی گئی ہے۔

۷) فطرت نسوانی : پروفیسر ہنری مارٹن کی کتاب کا اردو ترجمہ۔ اس کتاب میں فلسفیانہ انداز میں خواتین کی اخلاقی' معاشرتی اور ذہنی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

پروفیسر حافظ احمد یارؒ

سُوْرَةُ الْبَقَرَة

آیات ۱۰۶ -- ۱۰۷

(گزشتہ سے پیوستہ)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کیلئے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغہ 'الاعراب' الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغہ کیلئے ۱' الاعراب کیلئے ۲' الرسم کیلئے ۳' اور الضبط کیلئے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغہ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لئے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لئے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغہ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲ : ۶۴ : ۲ الاعراب

زیر مطالعہ دو آیات میں سے ہر ایک بلحاظ مضمون دو الگ الگ جملوں پر مشتمل ہے' اسی لئے دونوں آیتوں میں ہر جملے کے اختتام پر وقف مطلق کی علامت "ط" لگائی گئی ہے۔ پہلی آیت کا پہلا حصہ جملہ شرطیہ ہے' یعنی یہ شرط اور جزاء (جواب شرط) دونوں پر مشتمل ہے۔ ہر ایک جملے کے اعراب کی تفصیل یوں ہے۔

❶ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا۔

[ما] موصولہ شرطیہ (بمعنی "جو کچھ بھی کہ") ہے جس کی وجہ سے اگلا صیغہ فعل [ننسخ] مجزوم ہے' علامت جزم لام کلمہ (خ) کا سکون ہے۔ اور اس لحاظ سے "مَا" اس فعل کا مفعول

مقدم ہے جو محلاً منصوب ہے' جس میں مبنی ہونے کی وجہ سے کوئی ظاہری علامت نصب نہیں ہے۔ [مِن] جار اور [آیۃٍ] مجرور ہے۔ اس مرکب جاری میں اگر "من" کو تبعیض کے لئے سمجھا جائے تو پھر "مِن آیۃٍ" اس "ما" کی صفت بنے گا یعنی "جو کچھ بھی کہ کسی آیت میں سے" یا "جو کچھ حصہ آیت بھی" اور چونکہ "ما" محلاً منصوب ہے لہٰذا یہ مرکب جاری بھی محلاً منصوب ہی ہوگا۔ اور اگر "مِنْ" زائدہ برائے تنصیص نکرہ سمجھیں تو پھر بلحاظ محل (موقع) اسم شرط (ما) کا حال یا اس کی تمیز بن سکتا ہے (حال اور تمیز دونوں منصوب ہوتے ہیں لہٰذا اس صورت میں بھی "من آیۃ" محلاً منصوب ہی بنے گا) حال ہو تو ترجمہ بنے گا "جو کچھ بھی کہ کوئی بھی آیت ہوتے ہوئے (منسوخ ہو)" اور تمیز کی صورت میں ترجمہ کچھ یوں ہوگا "جو کچھ بھی کہ کسی بھی آیت کی مقدار" [یہ ایسے ہے جیسے "عندی رطلٌ زیتاً = میرے پاس ایک رطل (ایک پیمانہ) تیل ہے--- کی بجائے کہہ سکتے ہیں "عندی رطل مِن زیتٍ" مطلب ایک ہی ہے] ۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ یہ حال یا تمیز والی بات اُلٹی طرف سے کان کو ہاتھ لگانے والا تکلف ہی ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ مرکب جاری (من آیۃ) کا تعلق "مَا" سے ہی ہے' یا بصورتِ تبعیض یا بصورت تنصیص (اور دونوں صورتوں میں ترجمہ کا اصل فرق حصہ "اللغۃ" میں بھی بیان ہو چکا ہے۔ [اَوْ] حرفِ عطف اور [نُنْسِہا] میں "ننس" مضارع صیغہ جمع متکلم ہے جو سابقہ مجزوم (بوجہ شرط) فعل "نَنْسَخ" پر معطوف ہو کر مجزوم ہے۔ علامت جزم حرفِ علت لام کلمہ (ی) کا سقوط ہے (اصل نُنْسِی تھا) اور "ھا" ضمیر منصوب اس فعل "نُنْسِ" کا مفعول بہ ہے۔ یہاں تک جملہ شرطیہ کا پہلا حصہ (بیانِ شرط) مکمل ہوتا ہے۔ آگے جوابِ شرط (جزاء) شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ [نَاْتِ] جو صیغہ مضارع جمع متکلم ہے اسی (جوابِ شرط ہونے کی) وجہ سے مجزوم ہے۔ علامت جزم یہاں بھی حرفِ علت لام کلمہ (جو یہاں بھی "ی" تھی) کا سقوط ہے (یہ دراصل "نَاْتِیْ" تھا)--- شرط اور جزاء کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں' ان میں سے بڑی واضح اور عمدہ صورت (شرط کے) مضارع مجزوم کے جواب میں مضارع مجزوم (بغیر "فا" کے) کا لانا ہے۔ اسی جوابِ شرط ہونے کی وجہ سے "نَاْتِ" کے ترجمہ سے پہلے اُردو میں "تو" لگتا ہے۔ [بخیرٍ] جار (بِ) اور مجرور (خَیْرٍ کا تعلق فعل "نَاْتِ" سے ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ حرف الجر (بِ) تو فعل (نَاْتِ) کا صلہ ہے جس سے "اَتٰی یَاْتِی بِ" میں "لے آنا" کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح لفظ "خَیْر" یہاں مفعول ہونے کے لحاظ سے محلاً منصوب ہے کیونکہ اگر اس صلہ (بِ) کے بغیر اس فعل کے یہی (لے آنا والے) معنی ہوتے تو

عبارت "نَاْتِ خَیْراً" ہوتی [منھا] من حرف الجر یہاں تفضیلیة ہے جو افعل التفضیل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے (جو یہاں "خَیْر" ہے) اور "ھَا" ضمیر مجرور مفضل منہ (جس پر فضیلت دی جائے) کے لئے ہے اور اس کا مرجع لفظ "آیة" ہے جو پہلے گزر چکا ہے (یعنی اس آیت سے زیادہ اچھی / بہتر) [اَوْ] حرفِ عطف اور [مِثْلِھَا] مضاف (مثل) اور مضاف الیہ (ھا۔ ضمیر مجرور) مل کر "او" کے ذریعے لفظ "آیة" ہی پر عطف ہے جس کے لئے "ھا" (ضمیر) پہلے بھی آ چکی ہے۔ اب آپ اس بیانِ اعراب کے بعد حصہ اللغة میں بیان کردہ تراجم کی لغوی وجہ کے علاوہ نحوی وجہ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ یہاں تک شرط اور جوابِ شرط مکمل ہو کر ایک مضمون ختم ہوا ہے' لہٰذا یہاں وقف مطلق ہونا چاہئے۔

❷ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

[ا] ہمزۂ استفہام برائے تقریر (اقرار کا مفہوم) ہے اور [لَمْ تَعْلَمْ] میں ابتدائی "لَمْ" حرفِ جازم مضارع ہے جس سے مضارع کے معنی اُلٹ کر (قلب ہو کر) ماضی اور وہ بھی منفی کے ہو جاتے ہیں' اس لئے "لَمْ" کو حرفِ جزم و نفی و قلب بھی کہتے ہیں۔ "تَعْلَمْ" مضارع مجزوم "بِلَمْ" ہے' علامتِ جزم لام کلمہ (م) کا سکون ہے [اَنَّ] حرفِ مشبہ بالفعل ہے اور [اللّٰهَ] اس کا اسم منصوب ہے' علامت نصب آخری "ھ" کی فتحہ ہے۔ [عَلٰی کل شیءٍ] یہ مرکب جاری ہے جس میں "علٰی" حرف الجر کے بعد "کُلِّ" مجرور ہے اور آگے مضاف بھی ہے۔ علامت جر آخری "لِ" کی کسرہ ہے کیونکہ یہ خفیف (لام تعریف اور تنوین کے بغیر) بھی ہے اور "شَیءٍ" اس (کُل) کا مضاف الیہ (لہٰذا) مجرور ہے' علامت جر تنوین الجر (ـٍ) ہے اور یہ پورا مرکب جاری (علٰی کُلِّ شَیْءٍ) متعلق خبر (مقدم) ہے' یعنی اس کا تعلق اگلے لفظ [قدیرٌ] سے ہے جو "ان" کی خبر مرفوع ہے۔ علامت رفع تنوین رفع (ـٌ) ہے۔ گویا اصل عبارت یوں بنتی تھی کہ "اِنَّ اللّٰہ قدیرٌ علٰی کُلِّ شَیءٍ" مگر فاصلہ (آیت کے آخری لفظ) کی رعایت سے متعلق خبر (علٰی کُلِّ شَیْءٍ) کو خبر (قدیرٌ) پر مقدم کر دیا گیا ہے' جس سے قدرت کے کمال اور وسعت کی تاکید کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ اسی تاکید کے مفہوم کو بعض نے "سب کچھ کر سکتا ہے" کے (ترجمے کے) ذریعے ظاہر کیا ہے۔

❸ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

[اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ] ابھی اوپر گزرا ہے۔ اگلی عبارت میں [لَهٗ] جار مجرور (لام الجر (لِ) +

ضمیر واحد مذکر مجرور (ہٗ) مل کر خبر مقدم ہے جسے قائم مقام خبر بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ خبر ہی کا کام دے رہا ہے۔ اس کے بعد مُلْكُ اپنے بعد والی پوری ترکیب اضافی سمیت مبتدا مؤخر (لہٰذا) مرفوع ہے۔ علامتِ رفع "ُ" کا ضمہ ہے کیونکہ یہ لفظ آگے مضاف ہونے کے باعث خفیف بھی ہے۔ [السمٰوٰت] مضاف الیہ (لہٰذا) مجرور ہے' علامتِ جر آخری "اتِ" ہے جو جمع مؤنث سالم میں اعراب کی علامت ہوتی ہے (..... ات)۔ [و] عاطفہ ہے جس سے [الارض] "السمٰوٰت" پر معطوف ہو کر (خود بھی) مجرور بالاضافہ ہو گیا ہے' علامت جر "ضِ" کی کسرہ (ـِ) ہے کیونکہ الارض معرف باللام بھی ہے۔ یوں یہ پورا مرکب اضافی (مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) مبتداء مؤخر ہے جس کی خبر مقدم کا کام "له" (جار مجرور.....) دے رہا ہے۔ اور یہ پورا جملہ اسمیہ (مبتدا مؤخر + خبر مقدم) "ان" کی خبر لہٰذا محلاً مرفوع ہے۔ گویا اصل جملہ ایک طرح سے "اَنَّ اللّٰهَ مَالِكُ/ مَلِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" بنتا تھا مگر "له" کو خبر مقدم بنا کر "اسی ہی کے لئے / اسی ہی کا ہے" کا زوردار مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ یہ زور اور تاکید عام سادہ جملہ اسمیہ کے ذریعے ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔

۴ وَمَالَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ

[وَ] مستانفہ ہے جس کا ترجمہ تو "اور" ہی کیا جاتا ہے مگر اس میں "اور یہ بات بھی توجہ طلب ہے" کا مفہوم ہے' اسی لئے بعض نے اس "و" کے ترجمہ کی توسین میں یوں وضاحت کی ہے "اور (یہ بھی سمجھ رکھو کہ)"۔ [مَا] نافیہ حجازیہ ہے [لكم] جار مجرور (ل + کم) خبر مقدم (یا قائم مقام خبر) ہے جس کا مبتدا مؤخر آگے آ رہا ہے۔ [مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ] میں من جار ہے جو ظروف سے پہلے اکثر لگتا ہے۔ "دون" ظرفِ مکان ہے جو آگے مضاف بھی ہے' اور "اللّٰه" مضاف الیہ مجرور ہے۔ اگر شروع میں "مِن" نہ ہوتا تو ظرف منصوب ہو کر مضاف ہوتا یعنی بصورت "دون اللّٰه" (اور یہ ترکیب بھی قرآنِ کریم میں بہت جگہ آئی ہے۔ یہ مرکب (من دون اللّٰه) آگے آنے والے مبتداء مؤخر (ولی) سے متعلق ہے' یعنی اسی کا حال یا صفت کہہ سکتے ہیں۔ [مِن] زائدہ برائے تنصیص نکرہ ہے۔ [وَلِيٍّ] مبتدا مؤخر لہٰذا محلاً مرفوع ہے مگر یہ مجرور "بمن" ہے اور اسی "من" کی وجہ سے "من ولی" کا ترجمہ "کوئی بھی دوست / حمایتی" بنتا ہے۔ [و] عاطفہ ہے اور [لَا] تاکید نفی کے لئے ہے (صرف "نفی" (نہیں) تو ابتدائی "مَا" (الحجازیۃ) میں بھی موجود تھی) اسی تاکید کی وجہ سے یہاں "لا" کا ترجمہ "نہ ہی" سے ہوگا [نصير] واو عاطفہ کے ذریعہ مبتدا مؤخر (ولی) پر معطوف ہے۔ گویا دوسرا مبتداء مؤخر ہے۔

یہ بھی محلاً مرفوع ہے' اگرچہ مجرور بِمِن (وَلِیّ) پر عطف کی وجہ سے لفظاً مجرور ہی ہے۔ گویا اصل منفی (بما) جملہ بنتا تھا "مَالَکُم وَلِیٌّ وَنَصِیرٌ" (نہیں ہے تمہارا کوئی دوست اور مددگار) [اور یہ بالکل ایسا ہے جیسے کہیں "مَالَہ ابنٌ وَبِنتٌ - اس کی کوئی بیٹا' بیٹی نہیں ہے] - پھر "وَلِیّ" کے شروع میں "من" زائدہ برائے تنصیص لگنے سے "مِن وَلِیٍّ" کے معنی "کوئی بھی دوست" ہے اور واو عاطفہ کے بعد تاکید نفی کے لئے "لا" لگا کر "ولا" کے معنی ہوئے "اور نہ ہی"۔ پھر اس دوست / مددگار کی صفت یا حال کے طور پر اور تاکید کا مفہوم پیدا کرنے کے لئے "مِن دُونِ اللّٰہِ" کو مبتدا مؤخر سے بھی مقدم کر دیا گیا ہے' ورنہ سادہ جملہ "مَالَکُم وَلِیٌّ وَنَصِیرٌ مِن دُونِ اللّٰہِ" بھی ہو سکتا تھا مگر اس میں وہ تاکید اور نفی کے عموم (وسیع تر مفہوم) والی بات نہ ہوتی۔

۲ : ۶۴ : ۳ الرسم

اِس قطعہ آیات کے تمام کلمات کا رسم املائی اور رسم عثمانی یکساں ہے ماسوائے صرف ایک کلمہ "السمٰوٰت" کے جس کا رسم املائی تو "سَمَاوَات" ہے مگر رسم عثمانی میں بالاتفاق یہاں اس کی کتابت میں دونوں الف ("م" کے بعد والا اور "و" کے بعد والا) حذف کر دیئے جاتے ہیں۔ اور پھر پڑھنے کے لئے ان کو بذریعہ ضبط ظاہر کیا جاتا ہے۔ اسی لفظ کے رسم پر سب سے پہلے البقرہ :۲۹ [۲:۲۰:۳] میں بات ہوئی تھی' چاہیں تو اسے بھی دوبارہ دیکھ لیجئے۔

۲ : ۶۴ : ۴ الضّبط

اس (زیر مطالعہ) قطعہ کے ساتھ ہم اپنی اختلافاتِ ضبط کے بارے میں "تحریری" نمونے پیش کرنے کی پالیسی میں تھوڑی سی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں۔ اس تبدیلی کی وضاحت سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "رسم" و "ضبط" کے باہمی تعلق / ان کی اہمیت اور ضبط میں اختلاف کے بنیادی اسلوب کے بارے میں بعض تعارفی اُمور مختصراً بیان کر دیئے جائیں (ان میں سے بعض چیزوں کی طرف مقدمہ کتاب میں بھی اشارہ کر دیا گیا تھا)۔

ہم نے کتاب کے اصل موضوع "لغات و اعراب" کے ساتھ قرآنِ کریم کے "رسم" اور "ضبط" کے قواعد کا بیان اہل شوق اور اصحاب ذوق کی ضیافت طبع کے لئے شامل کر رکھا ہے۔ "رسم" کا تعلق قرآنی عبارات کی درست کتابت' طریق ہجاء و املاء سے ہے' جب کہ "ضبط" کا تعلق قرآنِ کریم کی مکتوب عبارت کو (بذریعہ حرکات) درست پڑھنے سے ہے' اگرچہ قرآنِ کریم

کے متعدد کلمات کو مسلّمہ اور مستند (سات یا دس) قراء ات کے مطابق مختلف صورتوں میں بھی پڑھا جاتا ہے۔ تاہم بنیادی طور پر تمام قراء ات رسم کے تابع ہوتی ہیں یعنی کلمہ کی ہجاء اور املاء کا طریقہ ایک ہی ہوتا ہے مگر اس کو کسی خاص طریقے پر پڑھنے کے لئے حرکات مختلف طریقے سے لگائی جاتی ہیں۔

● اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ سورۃ الفاتحہ میں "مَالِكِ" کو "مَلِكِ" بھی پڑھنا خود رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ تاہم اس کا قرآنی (عثمانی) رسم "ملك" (الف کے بغیر) ہے۔ اب "مَالِكِ" والی قراء ت (مثلاً عاصم' الکسائی اور خلف وغیرہ' جن میں سے حفص عن عاصم کی قراء ت ہی تمام ایشیائی ممالک میں رائج ہے) کے لئے اسے ضبط کے ساتھ بصورت "مٰلِكِ" لکھتے ہیں۔ مگر "مَلِكِ" والی قراء ت (مثلاً ورش اور قالون (عن نافع) اور الدوری (عن ابی عمرو) کی روایت کے مطابق اسے "مَلِكِ" ہی کے ضبط سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ تاہم بعض دفعہ ایک ہی قراء ت کے باوجود ضبط میں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً (قراء ت حفص ہی کے مطابق) "مَالِكِ" پڑھنے کے لئے "ملِكِ" کے علاوہ (جو بیشتر مشرقی ممالک کا ضبط ہے) اسی لفظ کو بصورت "مَٰلِكِ" بھی لکھتے ہیں (جو بیشتر عرب اور افریقی ممالک کا ضبط ہے---) البتہ بعض ایشیائی ملکوں (خصوصاً ایران اور ترکی) میں (جہاں حفص والی قراء ت ہی رائج ہے) لفظ کا اصل رسم الخط بگاڑ کر اس کا طریق ہجاء ہی اپنی ضرورت (قراء ت) کے مطابق بدل کر "مَالِكِ" ہی کر دیا گیا ہے۔ جو رسم عثمانی کی خلاف ورزی اور لہٰذا اصولی طور پر ایک غلط بات ہے--- بلکہ ان ملکوں میں رسم عثمانی کی اور بھی بہت سی خلاف ورزیوں کا رواج ہو گیا ہے۔

● اس طرح قرآنی یا عثمانی "رسم" کو تو ایک بنیادی حیثیت اور تقدس حاصل ہے مگر "ضبط" میں ہر ملک کے اپنے عام تعلیمی قواعد اور علمی مزاج کے مطابق ہمیشہ اصلاح اور تبدیلی ہوتی رہی ہے بلکہ یہ عمل اب بھی جاری ہے۔ بیشتر عرب اور افریقی ممالک میں ضبط کے قواعد عربی صرف و نحو کو مدنظر رکھ کر بنائے گئے ہیں مگر برصغیر اور دیگر ایشیائی ملکوں میں یہ قاعدے گرامر سے زیادہ صوتی قواعد کو سامنے رکھ کر بنائے گئے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ بعض ممالک کا طریق ضبط بلحاظ قواعد زیادہ دقیق اور جامع ہے۔ جب کہ بیشتر (عجمی) ممالک میں طریق ضبط کے قواعد اختصار اور اجمال پر مبنی ہوتے ہیں جن کی تفصیل استاد سے زبانی معلوم ہوتی ہے۔

● بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ "ضبط" خواہ کتنا ہی دقیق اور جامع ہو پھر بھی قرآنی کلمات کی درست قراء ت کے لئے استاد کی زبانی تعلیم کے بغیر چارہ نہیں۔ بلکہ قراء ت کے بعض طریقے تو محض علاماتِ ضبط کے ذریعے سکھائے ہی نہیں جا سکتے (مثلاً روم' اشمام' امالہ' اختلاس

وغیرہ) ہر ایک ملک میں رائج ضبط کے بنیادی قواعد (اجمالاً یا تفصیلاً) کسی "قرآنی قاعدہ" کے ذریعے اور استاد کی عملی تعلیم سے سکھائے اور پڑھائے جاتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ کسی ایک طریق ضبط کے مطابق پڑھا ہوا۔۔۔۔۔۔۔ خصوصاً ناظرہ خوان۔۔۔ کسی دوسرے ملک کے طریق ضبط کے مطابق لکھے گئے نسخہ قرآن (مصحف) سے درست تلاوت ہرگز نہیں کر سکتا۔

● ضبط کے ان مختلف طریقوں میں فرق کی بعض نمایاں وجوہ (یا مظاہر) کی بنیاد حسب ذیل اُمور ہیں۔

(۱) حرکاتِ ثلاثہ (زبر' زیر' پیش) کی شکل میں فرق اور ان حرکات کی صورت کے مطابق (علامت) تنوین کی مختلف صورتوں اور ان کے مواقع استعمال میں اختلاف' مثلاً اخفاء و اظہار کے لئے الگ الگ یا یکساں صورت تنوین۔

(۲) علامت سکون کی شکل میں فرق ("ﹾ" یا "ہ") اور اس کے مواقع استعمال یا عدم استعمال کا اختلاف۔

(۳) علامت تشدید (ّ) اور اس کے مواقع استعمال میں فرق' خصوصاً ادغام تام اور ناقص کی صورت میں اسے استعمال کرنا یا نہ کرنا۔

(۴) مُظہرۃ اور مُخفاۃ ("ن" اور "م") کا فرق ظاہر کرنا یا نہ کرنا اور مکتوب یا ملفوظ نون ساکنہ کے "م" میں اقلاب کو ظاہر کرنا یا نہ کرنا۔

(۵) ھمزۃ القطع کے لئے علامات کا فرق (ء' s' E وغیرہ) اور ان کے مواقع استعمال میں اختلاف۔

(۶) ہمزۃ الوصل کو ظاہر کرنے کے مختلف طریقے' جن میں سے سب سے سادہ اور سہل (اگرچہ غیر علمی) طریقہ برصغیر اور بہت سے ایشیائی ممالک کا ہے۔ اور نسبتاً پیچیدہ اور ناقص طریقہ عرب ممالک کا ہے کیونکہ اس میں زیادہ بھروسہ قاری کی عربی دانی پر کیا گیا ہے۔ اور سب سے جامع اور علمی طریقہ افریقی ممالک کا ہے۔

(۷) رسم میں محذوف (مگر قراءت میں ملفوظ) حروف کو ظاہر کرنے کے طریقے میں اختلاف (مثلاً "لَہٗ" کے بعد والی "و" "بِہٖ" کے بعد والی "ی" اور "مٰلِکِ" کے میم کے بعد والا الف)

(۸) رسم میں زائد موجود (مگر غیر ملفوظ) حروف کو ظاہر کرنے کا طریقہ (مثلاً "اُولٰئِکَ" میں "ی")

(۹) "و" اور "ی" ممدودہ کو علامت سکون دینا یا نہ دینا۔

(۱۰) خاص علاماتِ ضبط (اشمام' رَوم' اختلاس' اِمالہ وغیرہ) استعمال کرنا یا نہ کرنا۔

(۱۱) لام الف کے احکام کا فرق یعنی "لا" کا کون سا سرا الف ہے اور کونسا لام۔

❹ بعض حروف کے طریق اعجام میں فرق۔ مثلاً افریقی ممالک میں "ف" اور "ق" کو "ڤ" اور "ق" کی صورت میں لکھنا---- اور افریقی ممالک ہی میں آخر پر آنے والے حروف "ینفق" (ی ن ڤ ف) کو نقطے سے خالی رکھنا۔ اگرچہ اب بعض افریقی ملکوں میں ان دونوں چیزوں (ف ق کے اعجام اور آخر والے حروفِ "ینفق" والا قاعدہ) میں مشرقی ملکوں والا طریقہ اختیار کیا جانے لگا ہے۔

● اور اسی (مذکورہ بالا) فرق اور اختلاف کے مطالعہ اور مشاہدہ کے لئے کتاب میں "ضبط" کی بحث بھی شامل کر دی گئی ہے۔ یہ فرق قواعد کے بیان کی صورت میں بھی واضح کیا جا سکتا ہے (جیسا کہ شروع میں کیا بھی گیا تھا) اور ایک ہی تلفظ اور قراءت کے باوجود مختلف ضبط کے تحریری نمونے سامنے لانے سے بھی وضاحت کی جا سکتی ہے (جیسا کہ ہم کرتے چلے آئے ہیں) اور چونکہ دنیا بھر میں رائج قرآنی ضبط کی تمام صورتوں کو بطورِ نمونہ سامنے لانا ممکن نہ تھا اس لئے ہم نے صرف چار قسم کے (نمائندہ) نمونے پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ یعنی علی الترتیب ❶ برصغیر میں رائج ضبط (جس سے ہم بخوبی آشنا ہیں) ❷ ایران اور ترکی میں رائج ضبط (جو بہت سی باتوں میں مماثل ہوتا ہے) ❸ مصر اور ایشیائی عرب ممالک میں رائج طریق ضبط اور ❹ افریقی ممالک کا طریق ضبط (جو بہت سی باتوں میں عرب ممالک کے ضبط سے مشابہ ہوتا ہے)۔

● اس کے بعد ہم نے اب تک عموماً ہر قطعہ آیات کے ہر ایک کلمہ کے لئے اس "چہارگانہ" ضبط کا نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اب (اگرچہ خاصی دیر کے بعد) یہ فیصلہ کیا ہے کہ جو لفظ یا مرکب پہلے گزر چکا ہے اس کا آئندہ صرف گزشتہ حوالہ دے دیا جائے گا۔ اور اب بطورِ نمونہ صرف ان الفاظ اور مرکبات کو لیا جائے گا جو پہلی دفعہ سامنے آئیں گے یا جن میں ضبط کا کوئی خاص قاعدہ سامنے آئے گا۔ خیال رہے کہ اکثر الفاظ (یا مرکبات) کے حروف کے ضبط کا ماقبل اور مابعد والے حرف کے تلفظ (اور لہٰذا ضبط) سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے ایک ایک (مفرد) لفظ کی بجائے بعض دفعہ مرکب (کم از کم دو) الفاظ کو لینا پڑے گا۔

● اب اس نئی پالیسی کے تحت زیرِ مطالعہ قطعہ آیات کے کلمات کے ضبط کی صورت یوں بنتی ہے---- پہلے ہم ترتیب وار ان کلمات کا (گزشتہ حوالے کے ساتھ) ذکر کرتے ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں۔

"مَا" یہ لفظ اس سے پہلے ۴۵ دفعہ گزر چکا ہے۔ پہلی دفعہ البقرہ :۴ [۲: ۳: ۴] میں اس کے ضبط پر بات ہوئی تھی۔

"مِنْ" یہ لفظ مفرد مرکب اور ضبط کی مختلف صورتوں (مظہرہ' مخفاۃ یا متحرک) کے ساتھ

پچاس سے زائد دفعہ گزر چکا ہے۔ یہاں یہ نون مظہرہ ہے۔ پہلی دفعہ نون مظہرہ کا ضبط البقرہ :۴۹ [۲: ۳۲: ۴] میں آیا تھا۔ (نون مخفاۃ کا ضبط پہلی دفعہ البقرہ :۴ [۲: ۳: ۴] میں گزرا ہے)

"اَوْ" پہلی دفعہ البقرہ :۱۹ [۲: ۱۴: ۴] میں گزرا ہے۔

"بِخَیر" لفظ "خَیر" پہلی دفعہ البقرہ :۵۴ [۲: ۳۴: ۴] میں دیکھئے۔

"مِنْهَا" یہ لفظ اس سے پہلے آٹھ دفعہ گزر چکا ہے۔ پہلی دفعہ البقرہ :۲۵ [۲: ۱۸: ۱۴] میں آیا تھا۔ البتہ ما قبل کی تنوین کے ساتھ زیر مطالعہ میں پہلی دفعہ آیا ہے جس کی وجہ سے "م" پر تشدید آئی ہے یعنی "مِّنْهَا" کی صورت میں---- "اَوْ" کا حوالہ ابھی گزرا ہے۔

"اَلَمْ تَعْلَمْ" میں سے "اَلَمْ" کا ضبط پہلی دفعہ البقرہ :۳۳ [۲: ۲۳: ۴] کے "اَلَمْ اَقُلْ" میں گزرا ہے۔ "تَعْلَمْ" کے ضبط میں کسی کا اختلاف نہیں' سوائے اس کے کہ بعض علامتِ سکون "ہ" استعمال کرتے ہیں۔

"اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" یہ پورا جملہ البقرہ :۲۰ میں گزر چکا ہے' اور اس کے کلمات کے ضبط کے لئے دیکھئے [۲: ۱۵: ۴] صرف اس فرق کے ساتھ کہ یہاں "اَنَّ" ہے اور وہاں "اِنَّ" تھا۔

"مُلْكُ" پہلے البقرہ :۱۰۲ میں گزر چکا ہے [۲: ۶۲: ۴]۔

"السَّمٰوٰت والارض" کے تمام کلمات کے ضبط پر البقرہ :۳۳ [۲: ۲۳: ۴] میں بات ہوئی تھی۔

"وَمَا لَكُمْ" میں سے "وَ" سب سے پہلے الفاتحہ :۵ میں آیا تھا۔ "ما" پر ابھی اوپر بات ہوئی ہے۔ "لَكُمْ" اس سے پہلے "م" کے سکون اور مابعد والے میم کی تشدید کے ساتھ [۲:۲۰:۴] میں گزرا ہے۔ ویسے "لَكُمْ" مختلف صورتوں میں دس دفعہ گزر چکا ہے۔

"مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" پوری ترکیب کا ضبط البقرہ :۲۳ [۲: ۱۷: ۴] میں گزر چکا ہے۔

● باقی نئے کلمات اور تراکیب کے ضبط کے نمونے درج ذیل ہیں :

نَنْسَخْ' نَنْسَخْ' نَنسَخْ/ اٰیَةٍ' ءَایَةٍ' ءَایَةٍ/ نُنْسِهَا' نُنْسِهَا' نُنْسِهَا' نُنْسِهَا' نُنْسِهَا/ نَاْتِ' نَاْتِ' نَأْتِ' نَأْتِ/ مِثْلِهَا' مِثْلِهَا' مِثْلِهَا/ لَهُ' لَهُ' لَهُ/ لَهُ/ مِنْ وَّلِیٍّ' مِن وَلِیٍّ' مِنْ وَّلِیٍّ' مِنْ وَّلِیٍّ' /وَّلَا' وَلَا' وَلَا' وَلَا/ نَصِیرٍ' نَصِیرٍ' نَصِیرٍ' نَصِیرٍ۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد
کے
تعلیمی نظریات کا موازنہ

ظفر اقبال محسن کا تحقیقی مقالہ

کسی شخصیت کے بارے میں لکھنا' ادب کی اصناف میں سے مشکل ترین صنف سے تعلق رکھنے والا کام ہے اور یہ کام اس وقت اور بھی دقیق ہو جاتا ہے جب وہ شخصیت بہت بڑی اور ہمہ پہلو ہو۔ اس پر مستزاد یہ کہ دو شخصیات کا موازنہ ـــــ وجہ یہ ہے کہ شخصیت شناسی اور شخصیت نگاری میں ذاتی پسند و ناپسند کے باعث انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا ایک کڑے امتحان سے کم نہیں ہوتا اور کسی نہ کسی طرح مبالغہ آرائی کا پہلو در آتا ہے۔ کچھ ایسی ہی مشکل موضوع تحقیق سے متعلقہ دو عظیم شخصیات کے بارے میں لکھتے وقت پیش آئی جسے پروردگار عالم نے اپنے خصوصی لطف و کرم سے آسان بنا کر راقم حروف کو یہ ہمت بخشی کہ وہ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکے۔

ان میں سے علامہ اقبالؒ کی شخصیت وہ ہے کہ کوئی شخص خواہ آپ کے کلام کو سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو' آپ سے عقیدت رکھتا ہے۔ لیکن اس عقیدت کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بہت واضح ہے کہ علامہ کے فکر و فلسفہ' تعلیمات اور نظریات کی عمیق گہرائیوں تک پہنچنا اور علم کے بحر بے کراں میں سے چند قیمتی موتیوں کا منتخب کرنا' کسی بھی طرح سے آسان کام نہیں ہے۔ ان کی شخصیت کی سادگی کے برعکس ان کی فکر' ان کا فلسفہ' ان کے نظریات اس قدر گہرے' پُر مغز اور بصیرت افروز ہیں کہ معمولی سے "اِن پُٹ" لینے والے اقبال کے اس عظیم "آؤٹ پُٹ" سے ہم ہمیشہ مستفیض ہوتے رہیں گے۔ حقیقت میں وہی لوگ زندۂ جاوید ہیں جو معاشرے سے کچھ لینے کی بجائے معاشرے کو ہمیشہ ہمیش کام آنے والا

آؤٹ پُٹ دے جاتے ہیں۔ دراصل اِن پُٹ اور آؤٹ پُٹ کے موازنے کا یہ وہ پیمانہ ہے جس سے شخصیت شناسی' آئینے کی طرح کھل کر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور جس میں کسی جانبداری اور مبالغہ آرائی کا گمان بھی نہیں رہتا۔ یہی وہ معیار ہے جس پر زیر مطالعہ شخصیات اور ان کے نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے بارے میں لکھنا اس لئے مشکل تھا کہ ڈاکٹر صاحب نہ تو ایک ماہر تعلیم کے طور پر معروف ہیں اور نہ ہی ان کے تعلیمی نظریات کسی ایک جگہ مرتب حالت میں دستیاب ہیں۔ پھر علم کی مختلف اقسام اور لاتعداد ہمہ پہلو موضوعات پر قلم اٹھانے اور خطبات و دروس دینے کے باوجود انہوں نے مرتب حالت میں اپنے سوانحی حالات نہ کبھی تحریر فرمائے نہ بیان۔ اسی طرح ان کے تعلیمی نظریات' ان کے مختلف خطبات' دروس اور تصنیفات میں منتشر تو ملتے ہیں کسی ایک جگہ یکجا نہیں۔ ان سب کو مختلف ذرائع سے حاصل کرنا' منتخب کرنا اور تحریر کرنا ایک محنت طلب کام تھا جو بہرحال پایہ تکمیل تک پہنچ کر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

یہ کام کتنا ہی مشکل اور محنت طلب کیوں نہ ہو اس کی اہمیت اور ضرورت مسلمہ ہے۔ وہ اس لئے کہ کسی بھی کام' تحریک یا نظام میں نظریے کی حیثیت روح کی ہے اور بے نظریہ تعلیم سے نہ تو کچھ حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی وہ کہیں پہنچاتی ہے۔ بلکہ راقم حروف کی رائے میں بے نظریہ تعلیم' تعلیم ہی نہیں ہوتی۔ ہم پاکستانی بحیثیت قوم پچھلی نصف صدی سے جہالت اور بے مقصدیت کے اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارا نظام تعلیم اپنا نہیں ہے بلکہ انگریزوں سے مستعار لیا ہوا ہے۔ اس میں ہم آج تک اپنے فلسفہ و فکر کی روح داخل نہیں کر سکے۔ ہمارے اسلاف اور بزرگان ملت نے قرآن اور حدیث کے لازوال سرچشمہ ہدایت سے راہنمائی حاصل کرتے ہوئے زندگی کے ایک ایک گوشے سے متعلقہ نظریات پیش کئے ہیں اور امت مسلمہ کی صحیح سمت راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ لیکن امت مسلمہ کی بدقسمتی یہ ہے کہ ان کیلئے وہ نظریات' نظریات ہی رہ گئے۔ انہوں نے ان نظریات کو اپنی زندگیوں میں عملی حیثیت نہ دے کر اپنے لئے "شعار غیر" کو پسند کیا اور آج نتیجہ معلوم ہے کہ پچاس برس ہوئے جسمانی آزادی حاصل

کئے بگر ذہنی' فکری اور نظریاتی سطح پر ابھی تک ہم انہی کے غلام ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلاف کے افکار اور نظریات کی روشنی سے اپنے نظام زندگی کو منور کیا جائے اور بالخصوص تعلیم کے سلسلہ میں اس امر کی طرف توجہ دی جائے کہ اس مروجہ دوزنے نظام کو ختم کر کے قرآن وحدیث اور بزرگان ملت کے افکار و نظریات پر مبنی اپنا نظام تعلیم رائج کیا جائے تاکہ ہم بحیثیت قوم جہالت کے اندھیروں سے نکل کر علم کی روشنی کی طرف آ سکیں۔

اس تحقیقی مقالے کی تکمیل کے سلسلہ میں راقم حروف محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا شکر گزار ہے جنہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے دو تین دفعہ وقت دے کر مختلف سوالات کے تسلی بخش جوابات مرحمت فرمائے۔ اس سارے کام میں محترم جناب حافظ عاکف سعید اور برادرم محبوب الحق عاجز کا تعاون شامل رہا۔ اس مقالے کے لئے راقم کی راہنما استاد محترمہ خالدہ انجم صاحبہ کا شکریہ بے حد ضروری ہے جنہوں نے ہر موقعہ پر بھرپور راہنمائی فرمائی۔ علاوہ ازیں مصنف اپنے والدین' اساتذہ کرام اور اپنے دوست ملک سعید عالم کا سپاس گزار ہے جنہوں نے اس کام کے لئے ہمت افزائی کی۔ قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ اس پیش کش میں اگر کوئی سقم محسوس کریں تو مطلع فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

عن عبداللّٰہ بنِ مسعودٍ رضی اللہ عنہ قال قال رسولُ اللّٰہ ﷺ :

((لاَ حَسَدَ اِلاَّ فِی اثْنَتَیْنِ : رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالاً فَسَلَّطَهُ عَلٰی هَلَکَتِهٖ فِی الْحَقِّ' وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْحِکْمَةَ فَهُوَ یَقْضِی بِهَا وَیُعَلِّمُهَا)) (متفق علیه)

"صرف دو آدمی قابل رشک ہیں : ایک وہ شخص جسے اللہ نے مال عطا کیا ہے اور وہ اِسے راہِ حق میں لٹا دینے کے درپے ہے' اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے حکمت و دانائی سے بہرہ مند کیا ہے اور وہ اِس کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اِسی کی تعلیم دیتا ہے۔"

ابتدائیہ

موجودہ دور بجا طور پر نظریات، فلسفہ و فکر اور علوم و فنون کی بالادستی کا دور ہے۔ اقوام عالم علوم و فنون، ثقافت و روایات اور تہذیب و تمدن میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں ہیں کیونکہ پوری دنیا نے بہرحال یہ جان لیا ہے کہ بڑھتے ہوئے مسائل اور پھیلتی ہوئی مشکلات کا حل لوہے کے مادی آلات کے پاس نہیں بلکہ اصل شے وہ انسانی تفکر و تدبر اور وہ سوچ و فلسفہ ہے جو ان مشکلات کے صحیح حل تجویز کر کے انسانیت کو ان سے نجات دلا سکتا ہے۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

جہانِ تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

چنانچہ معاشرے کی تعمیر و ترقی اور اصلاح کے لئے نظریات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں کیونکہ ان ہی میں مسائل زندگی کے حل پنہاں ہوتے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ ان نظریات کو عملی جامہ پہنا کر انسانیت کی فلاح و بہبود کو ممکن بنایا جائے۔

دوسرے تمام شعبہ ہائے زندگی کی طرح تعلیم کے میدان میں بھی مختلف نظریات ہیں۔ آج کے دور میں تعلیم ایک منظم اور مربوط عمل کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ جیسے جیسے معاشرتی زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں میں نظریات کا اثر و نفوذ بڑھتا جا رہا ہے، اسی طرح تعلیم میں بھی نظریات کا اثر زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ معاشرتی تبدیلیاں اور حالات تعلیم پر اور تعلیم معاشرے پر اثر چھوڑتی ہے۔ معاشرہ چونکہ افراد کے مجموعے کا نام ہے اس لئے افراد کے نظریات تعلیم کو اور تعلیم افراد کے نظریات کو متاثر کرتی ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

اَفراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے مِلّت کے مقدر کا ستارہ

تاریخ اسلام اس لحاظ سے ایک منفرد مقام رکھتی ہے کہ مسلمان مفکرین کی ایک بڑی تعداد ہر دور میں موجود رہی ہے اور انہوں نے اپنی فکر' اپنے نظریات اور اپنی تعلیمات کے ذریعے مسلمانوں کی اصلاح اور انسانیت کی بہبود کے لئے راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا ہے اور یہی حال تعلیم کے میدان میں بھی ہے۔

قرآن حکیم اور احادیث نبویہ ؐ میں تعلیم کی اہمیت و فضیلت کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے' وہ محتاج تعارف نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے شروع سے علوم و فنون کو اپنا سرمایہ بنایا اور مسلمانوں کی تاریخ میں بڑی بڑی علمی شخصیات پیدا ہوئیں۔ تعلیم و تدریس کے میدان میں جن لوگوں نے بالخصوص اپنی فکر کے چراغ روشن کئے ان میں امام غزالیؒ' امام ابن خلدونؒ' شاہ ولی اللہؒ' امام ابن تیمیہؒ اور علامہ اقبالؒ کے نام نمایاں ہیں۔

ان میں سے علامہ اقبال وہ شخصیت ہیں جن کی تعلیمات نے اس زمانے میں مسلمانوں کو بے حد متاثر کیا ہے۔ آپ نے مسلمانوں کو ان کا الگ تشخص یاد دلانے اور انہیں ایک قوم کی حیثیت سے بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ نے اپنے نظریات' فلسفہ اور شاعری کو اصلاح احوال کے لئے استعمال کیا۔ سیاست' معیشت' اقتصاد' تعلیم' معاشرت' ثقافت' الغرض ہر شعبہ زندگی میں آپ کی تعلیمات مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے باعث تقلید ہیں۔ آپ قرآن و حدیث کی روشنی میں اجتہاد کے احیاء کے داعی ہیں اور مسلمانوں کو علمی و عملی میدان میں عروج کی راہ پر گامزن دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ تعلیمی میدان میں بھی آپ کے نظریات بہت واضح اور نمایاں ہیں۔ آپ کے یہ نظریات آپ کے فلسفے' شاعری' خطبات اور خطوط میں جابجا ملتے ہیں۔

موجودہ دور میں دولت اور وسائل رکھنے کے باوجود پوری دنیا میں مسلمان زوال پذیر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان علوم و فنون اور سائنس و ٹیکنالوجی میں پسماندہ ہیں۔ یہی حال پاکستان کا بھی ہے۔ لیکن اس دور زوال میں بھی ایسی شخصیات ہیں جو اپنی فکر' سوچ' نظریات اور تعلیمات کے ذریعے اصلاح احوال کی راہ تجویز کر کے مسلمانوں کو آمادۂ عروج کرنے میں مصروف ہیں۔ انہی میں سے ایک شخصیت ڈاکٹر اسرار احمد کی ہے۔ آپ اپنے گہرے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں دینی' تحریکی اور فکری میدانوں کے

علاوہ تعلیم و تدریس کے میدان میں بھی مصروفِ جہاد ہیں۔ آپ قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج قائم کر کے مسلمانوں کی علمی میراث کو محفوظ کرنے اور مسلمانوں کو رُو بہ عروج کرنے کی جدّوجُہد کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے تعلیمی نظریات آپ کی کتب اور آپ کے خطبات و دروس میں سے ملتے ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں مفکرین کی ہمہ گیر شخصیات اور پُر اثر نظریات کی بنیاد پر ان کے تعلیمی نظریات کو تحقیق کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس تحقیق میں دونوں مفکرین کے خیالات اور نظریات کا علم حاصل کرنے کے لئے ان کے تعلیمی نظریات میں مماثلات اور اختلافات کو زیرِ مطالعہ لایا گیا ہے۔

پاکستان چونکہ علامہ اقبال کے تصورِ فکر کا نتیجہ ہے اس لئے پاکستان میں تعلیمی نظام کی تشکیل و اصلاح کیلئے اقبال کے تعلیمی نظریات کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ علاوہ ازیں اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اقبال کے دور کے حالات اور موجودہ حالات میں بہت تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ اس تناظر میں یہ بھی ضروری ہے کہ موجودہ دور کے مفکرین اور دانشور حضرات کے نظریات کا بھی مطالعہ کیا جائے جو اسلامی روایات و اقدار کو جاننے اور سمجھنے کے ساتھ ساتھ موجودہ مسائل اور ضروریات کا ادراک بھی رکھتے ہوں۔ اس مقصد کے تحت ڈاکٹر اسرار احمد جیسی دانشور اور عالم دین شخصیت کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد نہ صرف تحریک پاکستان میں پیش پیش رہے ہیں اور اس میں انہوں نے عملی طور پر حصہ لیا ہے بلکہ قیام پاکستان سے لے کر اب تک کے حالات پر ان کی گہری نظر ہے اور تاریخ پاکستان کا سارا نقشہ ان کے سامنے ہے۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی ذہنی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

باب دوم

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال

اقبال ـــــ صنم کدۂ ہندوستان کے مشہور فلسفی اور مؤمن شاعر ہیں۔ آپ نے اپنی شاعری اور تعلیمات کے ذریعے خوابِ غفلت میں ڈوبی ہوئی قوم کو جگانے اور ملت اِسلامیہ کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کی وہ ہمہ جہت اور دانش مندانہ ہستی جس نے مذہب' فلسفہ' تاریخ' شاعری' تعلیم اور دوسرے بہت سے شعبوں میں اپنی فکر رسا کے چراغ روشن کئے۔ سرزمین سیالکوٹ میں ۱۸۷۷ء میں جلوہ گر ہوئی۔ اِبتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہی حاصل کی' جہاں مولوی میر حسن جیسے روشن دماغ اَساتذہ سے اِکتسابِ فیض کا موقع ملا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے اور پنجاب یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم۔ اے کرنے کے بعد پیشہ معلّمی اِختیار کیا۔ لیکن تعلیم دینے کی بجائے تعلیم حاصل کرنے کی تڑپ ابھی سوا تھی' سو اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۹۰۵ء میں یورپ تشریف لے گئے۔ وہاں سے ایل۔ ایل۔ بی اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرکے سر زمین وطن لوٹے۔ آپ کے علم و فضل' شاعری اور دوسری اَدبی خدمات کے پیش نظر' حکومت برطانیہ نے آپ کو "سر" کے خطاب سے نوازا۔ ۱۹۲۸ء میں آپ نے جنوبی ہند کا دورہ کیا اور اِسلام کی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں پر لیکچرز دیئے۔ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے الٰہ آباد کے اجلاس میں تاریخی خطبہ دیا اور تصور پاکستان پیش کر کے "مصور پاکستان" کہلائے۔ عالم اسلام کے یہ نامور مفکر ۲۱/ اپریل ۱۹۳۸ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

اقبال علیہ الرحمۃ کی شاعری اسلام کی ترجمان اور مسلمانوں کی ثقافت کی آئینہ دار ہے۔ آپ کا "فلسفہ خودی" ہو یا "فلسفہ بندۂ مومن" "فلسفہ انسان کامل" ہو یا "فلسفہ اِنقلاب" "فلسفہ تعلیم" ہو یا "فلسفہ حرکت و عمل" الغرض آپ کا کوئی پیغام ہو' اِسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے عروج و ترقی کی تمناؤں سے لبریز نظر آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ

آپ کے کلام و پیغام میں رجائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ آپ اُمید کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے بلکہ حرکت و عمل کا درس دیتے ہیں۔

چنانچہ جب آپ نے مسلمانوں کو مایوسی اور زوال کا شکار دیکھا تو آپ کے ذہن میں اِصلاح احوال کی تجویز یہ سوجھی کہ مسلمانوں کو اپنے نظام تعلیم میں اِنقلابی تبدیلیاں لانا ہوں گی۔ اس مقصد کے لئے آپ نے ایک تعلیمی ادارے "دارالاسلام" کے قیام کا منصوبہ بنایا۔ آپ نے اپنے ایک عقیدت مند چوہدری نیاز علی سے جب اِس ادارے کے قیام کا ذکر کیا تو انہوں نے اِدارے کے لئے زمین بھی دے دی اور عمارت کی بنیاد بھی رکھ دی۔ علامہ اقبال نے الازہر یونیورسٹی مصر کے ریکٹر علامہ مصطفیٰ المراغی کو خط لکھا اور اُن سے ایک ایسے جدید تعلیم یافتہ عالم دین کو ہندوستان بھیجنے کی فرمائش کی جو انگریزی زبان میں جدید ذہن کو قرآن کی تعلیم دے سکے۔ آپ نے اس خط میں لکھا :

> "ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ایسا ادارہ قائم کریں جس کی نظیر آج تک یہاں وقوع میں نہیں آئی۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ اِس ادارے کو وہ شان حاصل ہو جو دوسرے دینی اور اِسلامی اداروں کی شان سے بڑھ چڑھ کر ہو۔ ہم نے اِرادہ کیا ہے کہ علوم جدیدہ کے فارغ التحصیل حضرات اور چند علوم دینیہ کے ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ ہم اُن کے لئے تہذیب حاضرہ کے شور و شغب سے دور ایک کونے میں ہوسٹل بنانا چاہتے ہیں۔ ہم ان کے لئے ایک لائبریری بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر قسم کی نئی اور پرانی کتابیں موجود ہوں' اور اُن کی رہنمائی کے لئے ہم ایک ایسا معلم جو کامل اور صالح ہو اور قرآن حکیم میں بصارت تامہ رکھتا ہو نیز انقلاب دور حاضرہ سے بھی واقف ہو' مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اَز راہ عنایت ایک روشن خیال مصری عالم کو جامعہ الازہر کے خرچ پر ہمارے پاس بھیج کر ممنون فرمائیں۔ مجھے توقع ہے کہ دین حق کا نور اِس مرکز سے ہندوستان کے تمام اَطراف و اَکناف میں پھیلے گا۔"

(شیخ عطاء اللہ: اقبال نامہ' حصہ اول' ص ۲۸۱)

افسوس کہ جامعہ الازہر کی طرف سے اِس سلسلے میں معذرت آگئی اور یہ منصوبہ روبہ عمل نہ ہو سکا۔ بہرحال حضرت اقبال نے اپنے فکر رسا اور کلام کے ذریعے وقتاً فوقتاً

تبدیلی اور ترقی پر زور دیئے رکھا اور اِصلاح احوال کی راہ تجویز کرتے رہے۔

حضرت اقبال علیہ الرحمہ نے اپنی حیات جاوداں کے کم و بیش پچیس سال براہ راست شعبہ تعلیم و تدریس میں گزارے۔ وہ تقریباً اُنیس (۱۹) سال طالب علم رہے اور چار سال بطور اُستاد پیشہ معلّمی سے بھی وابستہ رہے۔ لیکن بایں ہمہ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اقبال نے نہ تو دوسرے معروف مفکرین تعلیم کی طرح فن تعلیم یا درس و تدریس پر کوئی کتاب لکھی اور نہ ہی مخصوص طریقے سے مستقل، مربوط اور منظم فلسفہ تعلیم پیش کیا۔ البتہ آپ اپنی تقاریر، خطبات، مضامین اور اردو و فارسی کلام میں تعلیم کے مختلف گوشوں پر ایک نئے زاویہ نظر سے روشنی ڈالتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

۱) ۴/اپریل ۱۹۳۳ء کو دہلی میں وائسرائے ہند کی طلب کردہ تعلیمی کانفرنس میں علامہ اقبال کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

۲) اِسی سلسلہ میں لندن میں قائم کی جانے والی سب کمیٹی کے اقبال بھی ممبر تھے۔

۳) سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کے ساتھ مل کر اقبال نے نادر شاہ، شاہ افغانستان کی خصوصی دعوت پر افغانستان کا دورہ کیا اور وہاں کی تعلیمی منصوبہ بندی کے سلسلہ میں اپنے مشورے دیئے۔

اِن نکات سے یہ صاف عیاں ہے کہ وہ تعلیمی میدان میں کتنا اہم مقام اور کتنی گہری نظر رکھتے تھے۔

اقبال کے نظریات تعلیم میں سب سے پہلے جس بات پر توجہ کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اپنے دوسرے نظریات کی طرح، اقبال اپنے نظریہ تعلیم میں بھی دین اسلام کو بنیاد بناتے ہیں۔ یعنی اُن کا تعلیمی تصور، اِسلامی تصور ہے۔ تعلیم سے بھی وہ اِسلامی تعلیم مراد لیتے ہیں۔ ایک آفاقی اور عالمگیر دین ہونے کی حیثیت سے اِسلام ہی وہ واحد دین ہے جو اِنفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ نوع انسانی کی اِجتماعی زندگی کی اِصلاح و ترقی پر بھی زور دیتا ہے۔ چنانچہ اقبال بھی اپنے نظریات کے باب میں جابجا اِسلام اور قرآن کی آفاقی تعلیمات سے روشنی لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ آئندہ صفحات میں اقبال علیہ الرحمۃ کے تعلیمی نظریات پیش کئے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے تعلیمی نظریات

تصورِ حقیقت

علامہ اقبالؒ کے نزدیک یہ کائنات خود بخود اور آپ سے آپ وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کو حکیم و دانا اور قادرِ مطلق ہستی یعنی اللہ نے پیدا کیا ہے۔ حقیقت مطلقہ (Absolute Reality) صرف اُسی کی ذات ہے۔ مادی عالم خود حیات سرمدی کی پیداوار ہے' مادی عالم کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔ اللہ کی ذات مطلقہ کی ماہیت ادراک میں نہیں آسکتی۔ خدا کو اقبال "انائے مطلق" یا "انائے کبیر" سے تعبیر کرتے ہیں۔ تمام مخلوقات اسی انائے کبیر اور اسی حقیقت مطلقہ کی ہستی مطلق میں سے سرزد ہوئی ہیں' لیکن خدا چونکہ خود ایک انا ہے' اس لئے وہ "اناؤں" ہی کا خالق ہے۔ تمام کائنات نفوس پر مشتمل ہے جو کہ مختلف مدارج ارتقاء میں ہیں۔ قرآن میں آدم کا تصور اس حقیقت کا اِعتراف ہے کہ حیات اَبدی کے تمام ممکنات انسان میں مضمر ہیں۔ انسانی زندگی کا مقصد و مدعا ان ممکنات کو معرض وجود میں لانا ہے۔ {۱}

حضرت علامہ اقبالؒ کے نزدیک حقیقت ایسے اجزاء کا مجموعہ ہے جو تصادم کے واسطے سے ربط و امتزاج پیدا کر کے کل کی صورت میں تبدیلی کی سعی کر رہے ہیں۔ دراصل بقائے شخصی اور زندگی کے علم و ارتقاء کے لئے تصادم بہت ضروری ہے۔ علامہ کے نزدیک جہد مسلسل ہی زندگی کی حقیقت ہے۔ نیاز فتح پوری کی رائے میں "علامہ اقبال کے تصورِ حقیقت کی بنیاد عشق پر ہے اور عشق دراصل حرکت و عمل کا دوسرا نام ہے"۔ {۲}

علامہ کے نزدیک حقیقت ایک ایسی ذات ہے جو تمام افراد کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے' ایک ایسا کلیہ جس میں تمام کلیات آجاتے ہیں' ایک ایسی قدر جو تمام اقدار کو محیط کئے ہوئے ہے۔ وہ ذات مطلق بذات خود علم کامل' خیر کامل اور حسن کامل ہے۔

تصورِ کائنات

شاعر مشرق علامہ اقبال کے نظریات' سوچ' فکر اور فلسفے عالمگیر اہمیت کے حامل

ہونے کے ساتھ ساتھ آفاقی و عالمگیر سطح کے بھی ہیں۔ اس لئے وہ اپنے تصورِ کائنات میں بھی محدودیت کا شکار نہیں ہوئے۔ اقبال کسی مقید' محدود اور طے شدہ کائنات کے قائل ہی نہیں' ایسی کائنات جس میں کبھی کوئی نئی شے' نئی بات نہ تو وجود میں آئی ہو' نہ ہی آتی ہو۔ بلکہ اقبال نے کلام پاک کی روشنی میں یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ یہ کائنات کسی اتفاقی حادثے کا کرشمہ نہیں اور محض فضول پیدا نہیں کردی گئی' بلکہ یہ اپنے اندر ایک اہم بامعنی صداقت رکھتی ہے۔ اِس کائنات میں پھیلاؤ' ارتقاء اور انقلاب کی صفات موجود ہیں۔

اقبال اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اس کائنات کو عبث اور فضول نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ اس کے ذریعے انسان اور خدا کے تعلق کو سمجھنے میں مدد لی جانی چاہئے۔ دراصل یہ سوچ قرآنی تعلیمات میں تدبر کا نتیجہ تھی کیونکہ قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے :

"ہم نے زمین و آسمان اور ان کی تمام چیزوں کو یونہی بیکار پیدا نہیں کیا بلکہ ان کی تخلیق حقیقت پر مبنی ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے"۔ (الدخان : ۳۸-۳۹)

چنانچہ علامہ اقبال کائنات کو ایک کھیل نہیں سمجھتے تھے بلکہ آپ اسے جامد و ساکت سمجھنے کی بجائے ہر دم پیہم رواں دواں تصور کرتے تھے۔ آپ فرماتے ہیں :

"کائنات کی آفرینش اس لئے نہیں ہوئی کہ تخلیق کا عمل ایک کھیل ہے' وہ ایک حقیقت ہے جس کا اعتراف کرنا ہو گا۔ وہ کوئی جامد کائنات نہیں' نہ ایک ایسا موضوع جس کی تکمیل ختم ہو چکی اور جو بے حرکت اور ناقابل تغیر و تبدل ہے۔ برعکس اس کے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باطن میں ایک نئی آفرینش کا خواب پوشیدہ ہے"۔ {۳}

علامہ اقبال جامد اور قنوطی کائنات کی نفی کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کائنات کی تکمیل و تشکیل ابھی اپنے مراحل میں ہے۔ اس حقیقت کی طرف آپ نے اپنی شاعری میں بھی اشارہ کیا ہے' جیسا کہ بال جبریل میں ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کُن فیکون {۴}

حضرت علامہ اقبال کی تعلیم یہ ہے کہ اِس کائنات میں غور و فکر اور تدبر کیا جائے۔

وہ فرماتے ہیں :

"قرآن پاک کے نزدیک یہ شمس و قمر' یہ سایوں کا امتداد' یہ اختلاف لیل و نہار یہ رنگ و زبان کا فرق اور یہ قوموں کی زندگی میں کامیابی و ناکامی کے دنوں کی آمد و شد' حاصل کلام یہ ہے کہ یہ سارا عالم فطرت جیسا کہ بذریعہ حواس ہمیں اس کا ادراک ہوتا ہے حقیقت مطلقہ کی آیات ہیں اور اسی لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان پر غور و فکر سے کام لے۔ یہ نہیں کہ بہروں اور اندھوں کی طرح ان سے اعراض کرے۔ کیونکہ جو کوئی اس زندگی میں اندھوں کی طرح ان آیات سے اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے وہ آگے چل کر بھی اندھا ہی رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ محسوس اور ٹھوس حقائق پر بار بار توجہ کی اس دعوت کے ساتھ ساتھ جس کی قرآن نے تعلیم دی ہے' جب مسلمان رفتہ رفتہ اس حقیقت کو پا گئے کہ کائنات میں روانی اور حرکت ہے' وہ متناہی اور اضافہ پذیر ہے' تو انجام کار یونانی فلسفہ کی مخالفت پر' جس کا اپنی حیات ذہنی کے ابتداء میں انہوں نے بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ کیا تھا' اتر آئے۔"{۵}

تصورِ علم

اقبال کے نزدیک علم کا تصور یہ ہے "علم درحقیقت شعور ہی کے ایک مرتب اور منظم بیان کا دوسرا نام ہے' لہٰذا شعور کو حیات ہی کے خالصا روحانی اصول کی شکل ٹھہرانا چاہئے"۔{۶}

"ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ علم انسان کی نوعیت تصوری ہے اور تصوری علم کا یہی حربہ ہے جسے ہاتھ میں لے کر انسان حقیقت مطلقہ کے مرئی یا قابل مشاہدہ پہلوؤں کی طرف قدم بڑھاتا ہے"۔{۷}

اقبال کے نزدیک علم

۱) باطل شکن ہوتا ہے اور باقاعدہ نظام کے تحت وجود پاتا ہے۔
۲) حق نما' حرکت پذیر اور متنوع ہوتا ہے۔
۳) دل و نظر اور فکر و وجدان کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔

۴) زمانہ 'حیات اور کائنات کو ایک ہی وحدت کے مظاہر تصور کرتا ہے اور یہ کہ سب ارتقائی مدارج طے کر رہے ہیں اور ان کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ "علم کو جدید و قدیم کے مدارج میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ تو اپنے ارتقائی مدارج طے کرتا رہا ہے۔ یہ تو چشمہ حیات ہے جو برابر جاری رہتا ہے۔ ان کا کہنا ہے "علم اپنے فکر و وجدان کی ہم آہنگی ہی سے افراد کے ذہن و کردار کی تربیت کر سکتا ہے"۔ {۸}

اقبال فرماتے ہیں :

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہو جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
زمانہ ایک' حیات ایک ' کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصہ جدید و قدیم
چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریک نسیم {۹}

اقبال کے نزدیک علم سوز دماغ اور کاوش ذہن کا نتیجہ ہے۔ یہ قوت تسخیر اور قوت تعمیر بھی پیدا کرتا ہے اور احساس کی لذت بھی مہیا کرتا ہے۔ یہ علم ہی ہے جو اہل دانش کو اہل نظر بناتا ہے۔ اقبال کے نزدیک علم کی سب سے بڑی غرض و غایت بھی یہی ہونی چاہئے۔ خواجہ غلام السیدین کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں:

"علم سے مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہئے۔ اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔ یہ علم 'علم حق کی ابتدا ہے"۔ {۱۰}

علامہ اقبال فرماتے ہیں :

"وہ علم جو شعور میں نہیں سما سکتا' اس کا دوسرا نام عشق ہے"۔ {۱۱}

گویا علم اور عشق اقبال کے نزدیک دونوں کے دونوں "علم" ہی ہیں۔ فرق صرف ذریعہ

حصول کا ہے۔ اول الذکر کے ذرائع حصول "حواس" ہیں اور ثانی الذکر کا ذریعہ حصول حواس نہیں بلکہ ماورائے حواس ہے۔ آپ نے اس کی وضاحت اس طرح بیان کی ہے :

"یہ علم (یعنی علم بالحواس) علم حق کی ابتدا ہے اور وہ علم جو شعور میں نہیں سما سکتا (یعنی وجدانی علم یا عشق) علم حق کی آخری منزل ہے"۔ {۱۲}

اس کی مزید تشریح آپ نے ایک فارسی شعر میں یوں کی ہے :

علمِ حق اول حواس ' آخر حضور
آخرِ اُو می نہ گنجد در شعور

علم کی اقسام

علامہ اقبال کے نزدیک علم کی اقسام درج ذیل ہیں :

۱) فلسفیانہ مضامین : یہ وہ علوم ہیں جو غور و فکر اور تدبر و تفکر سے وجود میں آتے ہیں۔ ان میں فلسفہ' حکمت' علم ہندسہ اور طب کی تعلیم شامل ہے۔

۲) ادبی و فنی مضامین : وہ علوم جو زبان و ادب اور فن سے متعلق ہوں ان میں ادبیات مثلاً اردو ادب' فارسی ادب' عربی ادب' انگریزی ادب اور فنون لطیفہ کے مضامین شامل ہیں۔

۳) تجربی علوم : وہ علوم جو علمی تجربات سے تعلق رکھتے ہیں۔

۴) سائنسی علوم : وہ علوم جو تجربہ و مشاہدہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

۵) مذہبی علوم : ان میں قرآن و حدیث اور تفسیر کی تعلیم شامل ہے۔

۶) سماجی علوم : ان میں سیاست' اقتصادیات اور معاشیات وغیرہ شامل ہیں۔

۷) معاشرتی علوم : وہ علوم جو معاشرے کے متعلق ہیں۔ مثلاً عمرانیات وغیرہ۔

۸) روحانی علوم : جو صوفیانہ واردات اور تزکیہ نفس کے متعلق ہیں' مثلاً تصوف و سلوک وغیرہ {۱۳}

ذرائع علم

علامہ اقبال نے بنیادی طور پر تین ذرائع علم بیان کئے ہیں :

۱) وحی الٰہی (وحی جلی+وحی خفی)

۲) حواس وادراک' عقل وفہم' مشاہدۂ کائنات

۳) ماورائے حواس وادراک' قلب ووجدان' صوفیانہ واردات

۱) وحی الٰہی : اقبال کی رائے میں وحی الٰہی ہی دراصل علم کی اصل ہے۔ وہ اس کو حقیقت مطلقہ تک رسائی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں :

"انبیاء کے علم کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے جس میں غلطی اور خطا کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ان مشاہدات وواردات کو صوفیانہ واردات اور مشاہدات سے مشابہت ہے تو صرف اتنی کہ دونوں صورتوں میں ادراک بالحواس کا عمل معطل رہتا ہے۔ ورنہ انبیاء کے مشاہدات کی حیثیت اپنی جگہ پر مخصوص اور منفرد ہے"۔ {۱۴}

وحی الٰہی کے بارے میں علامہ فرماتے ہیں :

"تعلیمات قرآنی کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے "حقیقت کے اس پہلو کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے" کو بڑی اہمیت دی ہے"۔ {۱۵}

۲) حواس وادراک : حواس وادراک باعقل کو بھی علامہ ذریعہ علم سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے متعلق ان کی آراء یہ ہیں :

۱) یہ علم کی محض ابتداء کا ذریعہ ہے۔

۲) اس علم کو دین کے تابع رکھنا بے حد ضروری ہے۔

۳) اگر اسے دین کے تابع نہ رکھا جائے تو یہ محض شیطنت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال اپنے کلام میں جا بجا "عقل" پر "عشق" کی فوقیت کو ثابت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں ؎

بے خطر کُود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی {۱۶}

یعنی عشق' علم کے ان مدارج اور شعور کی ان منازل تک رسائی حاصل کرلیتا ہے جہاں

تک عقل کی رسائی ممکن ہی نہیں۔

۳) قلب و وجدان 'صوفیانہ واردات یا عشق : وجدان کے ذریعے حاصل ہونے والے علم کے لئے اقبال نے "عشق" "وجدانی علم" یا "علم بالوجی" وغیرہ کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ یہ ایسا علم ہے جس کا ذریعہ حواس کی بجائے ماورائے حواس یا وحی و وجدان ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کے سوتے قلب انسانی سے پھوٹتے ہیں۔ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ علم کسبی نہیں بلکہ وہبی ہوتا ہے۔ بہرکیف اقبال کے نزدیک علوم عقلی یا علم بالحواس علوم کی ابتداء اور علوم وجدانی یا عشق 'اس کی انتہا ہے۔

سو یہ تھے تین بنیادی ذرائع علم جن کا بیان اقبال کے تعلیمی نظریات میں ملتا ہے۔ لیکن محمد احمد خان لکھتے ہیں کہ اقبال نے اپنے چوتھے خطبے

THE HUMAN EGO, HIS FREEDOM AND IMMORTALITY

یعنی "انسانی خودی 'اس کی آزادی اور بقا" کے آغاز میں بتایا ہے کہ از روئے قرآن 'علم کے تین ذرائع ہیں۔ یعنی :

1۔ تاریخ' 2۔ خارجی فطرت' 3۔ نفس انسانی {۱۷}

بہرحال جو تین بنیادی ذرائع علم بیان کئے گئے ہیں ان سے حاصل ہونے والے علوم کی تفصیل یہ ہے :

۱) وحی الٰہی (علم شریعت اور تعلیم 'حکمت و دانائی)
۲) صوفیانہ واردات 'وجدان و عشق (روحانی علوم و باطنی علوم وغیرہ)
۳) عقل یا حواس و ادراک (فلسفہ 'سائنس 'جغرافیہ 'آرٹ 'ڈاکٹری وغیرہ)

علم کے ذرائع اور ان سے حاصل ہونے والے علوم اور ان کی اقسام اس شکل سے واضح کی گئی ہیں :

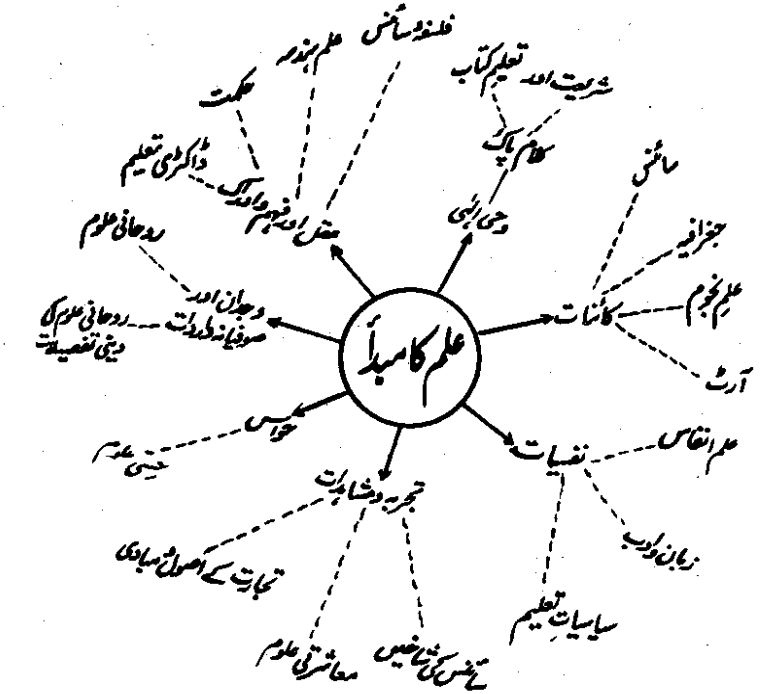

ذرائع علم سے حاصل ہونیوالے علوم اور انکی اقسام

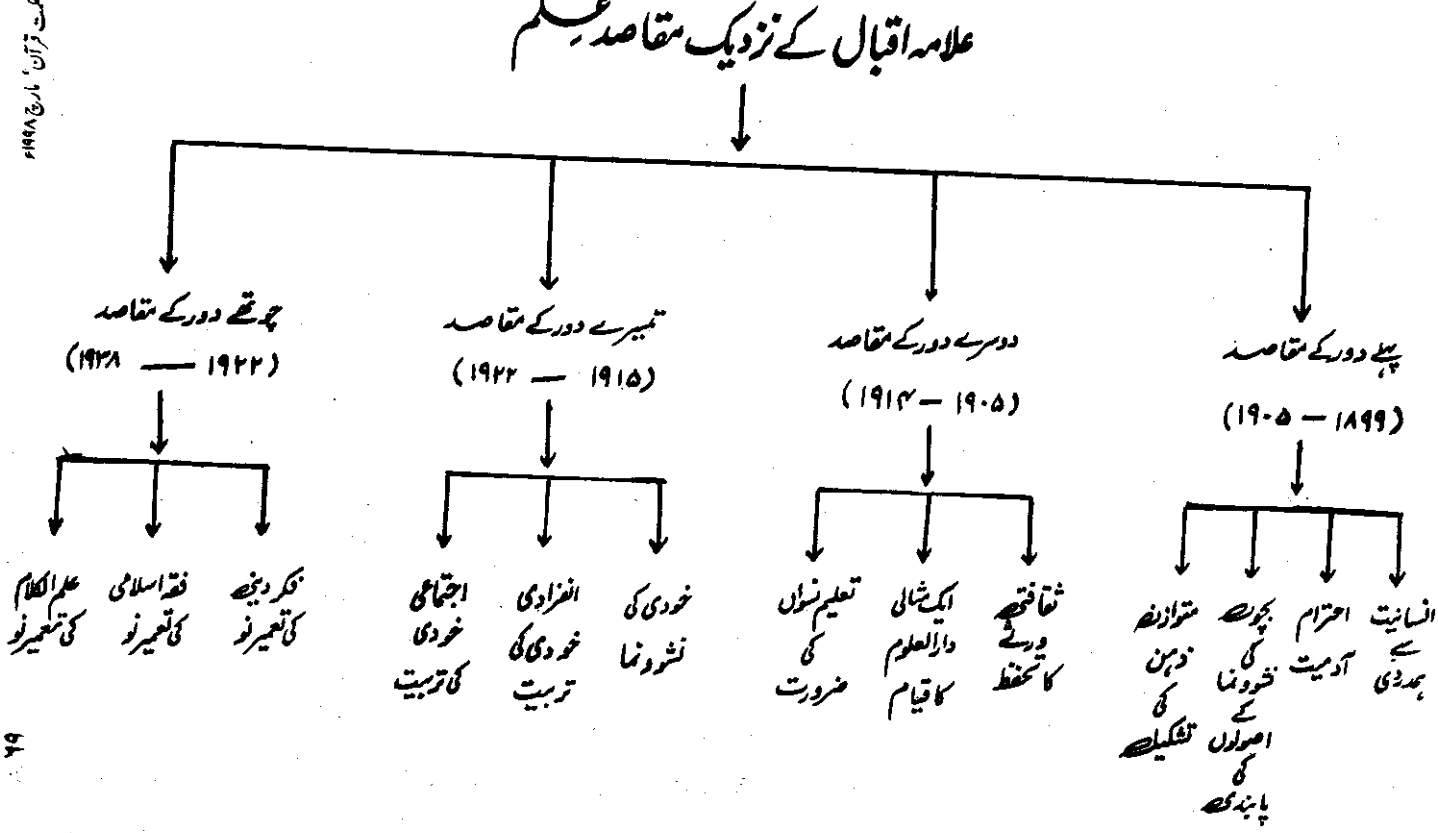

علامہ اقبال کے نزدیک مقاصدِ علم

- پہلے دور کے مقاصد (۱۸۹۹ — ۱۹۰۵)
  - انسانیت سے ہمدردی
  - احترام آدمیت
  - بچوں کی نشوونما کے اصولوں کی پابندی
  - متوازن ذہن کی تشکیل
- دوسرے دور کے مقاصد (۱۹۰۵ — ۱۹۱۴)
  - ثقافتی ورثے کا تحفظ
  - ایک مثالی دارالعلوم کا قیام
  - تعلیم نسواں کی ضرورت
- تیسرے دور کے مقاصد (۱۹۱۵ — ۱۹۲۲)
  - خودی کی نشوونما
  - انفرادی خودی کی تربیت
  - اجتماعی خودی کی تربیت
- چوتھے دور کے مقاصد (۱۹۲۲ — ۱۹۳۸)
  - فکر دینی کی تعمیر نو
  - فقہ اسلامی کی تعمیر نو
  - علم الکلام کی تعمیر نو

مقاصدِ تعلیم

مختلف مفکرین نے اقبال کے مقاصد تعلیم پر مختلف حوالوں سے روشنی ڈالی ہے۔ ادارۂ مصنفین پاکستان نے "اقبال کا نظریہ تعلیم" میں اقبال کے مقاصد تعلیم کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے :

۱) ابتدائی تعلیم کے بنیادی مقاصد
۲) بالغ افراد کے مقاصد یا دوسری منزل کے مقاصد

۱) ابتدائی تعلیم کے بنیادی مقاصد : کتاب مذکورہ بالا میں ابتدائی تعلیم کے حوالے سے اقبال کے پیش کردہ مندرجہ ذیل بنیادی مقاصد بیان کئے گئے ہیں :

۱) دینی و اخلاقی تربیت
۲) ثقافت و روایات سے واقفیت
۳) تعمیر کردار
۴) تعلیم بمطابق نفسیات
۵) جذبہ قومیت و حب الوطنی

۲) بالغ افراد کے مقاصد یا دوسری منزل کے مقاصد : دوسری منزل کے یہ مقاصد بیان کئے گئے ہیں :

۱) انفرادیت کی نشوونما (خودی)
۲) عملی قوتوں کا فروغ
۳) جذبہ ایمانی کا فروغ
۴) تسخیر النفس و آفاق
۵) ملت بیضا کا اتحاد و تنظیم {۱۸}

لیکن بختیار احمد صدیقی نے "اقبال بحیثیت مفکر تعلیم" میں اقبال کے مقاصد تعلیم کی تقسیم اس سے مختلف انداز میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"اقبال کے ذہنی ارتقاء کے مختلف مدارج کو سامنے رکھ کر ہم ان کی تعلیمی فکر کو

مندرجہ ذیل چار اَدوار میں تقسیم کرسکتے ہیں :

۱) پہلا دَور (۱۸۹۹ء۔۱۹۰۵ء) اِس دوران آپ نے "بچوں کی تعلیم و تربیت" پر خالص نفسیاتی اصولوں پر مبنی ایک مقالہ لکھا جو جنوری ۱۹۰۶ء کے رسالہ "مخزن" میں شائع ہوا۔

۲) دوسرا دَور (۱۹۰۵ء۔۱۹۱۴ء)۔ اس دور میں آپ انگلستان اعلیٰ تعلیم کے لئے گئے ہوئے تھے۔

۳) تیسرا دَور (۱۹۱۵ء۔۱۹۲۲ء) اِس دوران آپ کی فارسی مثنوی "اَسرارِ خودی" شائع ہوئی۔

۴) چوتھا دَور (۱۹۲۲ء۔۱۹۳۸ء) اِس دور میں آپ نے "فقہ اسلامی میں اجتہاد کے تصور" پر انگریزی میں ایک مقالہ لکھا۔

آیئے اب ان مختلف ادوار میں اقبال کے مقاصد تعلیم کا جائزہ لیں :

۱) پہلے دور کے مقاصد تعلیم : انسانیت سے ہمدردی' احترام آدمیت' بچوں کی نشوونما کے اصولوں کی پابندی' متوازن ذہن کی تشکیل۔

۲) دوسرے دَور کے مقاصد : ثقافتی ورثے کا تحفظ' ایک مثالی دارالعلوم کا قیام' تعلیم نسواں کی ضرورت۔

۳) تیسرے دَور کے مقاصد تعلیم : خودی کی نشوونما' انفرادی خودی کی تربیت' اجتماعی خودی کی تربیت۔

۴) چوتھے دَور کے مقاصد تعلیم : فکر دینی کی تعمیرنو' فقہ اسلامی کی تعمیرنو' علم الکلام کی تعمیرنو وغیرہ۔ {۱۹}

نصابِ تعلیم

عمل تعلیم میں نصاب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ نصاب دراصل وہ لائحہ عمل ہے جو مقاصد تعلیم کے حصول کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ نصاب کی اہمیت کے پیش نظر بہت سے مفکرین نے اپنی سمجھ کے مطابق مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ اقبال نے اپنے دور کے

مروجہ نصاب (دینی و دنیوی) پر شدید تنقید کی ہے اور اصلاح احوال کے لئے اپنی رائے پیش کی ہے۔

نصاب کے سلسلہ میں اقبال نے بھی بعض مضامین کی تدریس کی خصوصی تلقین کی ہے۔ کسی بھی مکمل نظام تعلیم میں چار پانچ مضامین تو ضروری ہوتے ہیں۔ ان مضامین کا ایک سلسلہ وہ ہے جنہیں فلسفیانہ مضامین کہتے ہیں اور دوسرا جنہیں وہ ادبی و فنی مضامین یا ادبیات اور فنون لطیفہ کا نام دیتے ہیں۔ تیسرا سلسلہ مضامین وہ ہے جنہیں تجربی علوم کہا جاتا ہے' مثلاً سائنسی علوم جن کا تعلق زیادہ تر تجربے اور مشاہدے سے ہے۔ ان کے علاوہ اور ان سب سے اہم اقبال کے نزدیک ایک سلسلہ مضامین اور بھی ہے جسے وہ علم دین سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک سلسلہ اقبال کے نزدیک سماجی علوم کا ہے۔

ان علوم کے بعد تاریخ کا علم اقبال کے نزدیک بہت علم ہے۔ اقبال جب دیکھتے ہیں کہ مروجہ نظام تعلیم کو صرف ذریعہ معاش تک ہی محدود کر لیا گیا ہے اور انسان معاش کے ہاتھوں مجبور ہو کر غلامی و بے نوائی اختیار کئے ہوئے تو انہیں قلق ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش {۲۰}

تعلیم کو اسی طرح معاشی نقطہ نظر تک محدود رکھنے نے ہمیں شکم کا غلام بنا دیا ہے اور ہم فطرت کے اسرار و رموز کے ادراک سے محروم ہو گئے ہیں۔

نصاب کے سلسلہ میں مضامین کے انتخاب کے حوالے سے اقبال فرماتے ہیں :

"نصاب میں ایسے مضامین کا انتخاب ہونا چاہئے جس میں زندگی کا روشن پہلو جھلکتا ہو' تاکہ طلبہ ان کے مطالعے کے بعد کشمکش حیات میں استقلال' خودداری اور اعتماد کے ساتھ حصہ لے سکیں۔" {۲۱}

محمد احمد خان نے نصاب کے حوالے سے مندرجہ ذیل نکات کے ذریعے علامہ اقبال کے تصور نصاب کو بیان کیا ہے :

☆ نئی دینیات اور نئے علم کلام کی تدوین کی جائے۔
☆ اسلامی فقہ کی تشکیل جدید کی جائے۔

☆ قدیم دینی مکاتب کے فارغ التحصیل افراد کو جدید ریاضی' سائنس اور فلسفہ کی تعلیم دی جائے۔ ان میں سے جو افراد سائنس میں ریسرچ کا ذوق رکھتے ہوں انہیں اس میں ریسرچ کا موقع دیا جائے۔

☆ تاریخ پر بھی ان (طلبہ) کی گہری نظر ہونی چاہئے۔

☆ اسلامی علوم کے تمام شعبوں مثلاً قرآن' حدیث کلام فقہ اور تفسیر وغیرہ کا تحقیقی مطالعہ کرانا ہو گا۔

☆ یہ مطالعہ بالواسطہ نہ ہو یعنی یہ کہ ان تمام شعبوں کی متعلقہ کتب کے انگریزی یا اردو تراجم سے کام نہیں چلے گا' بلکہ انہیں ان کی اصلی زبان (عربی) میں پڑھنا ہو گا۔

☆ اسلامی ریسرچ کے شعبہ میں شریک یہ طلبہ ساتھ ساتھ یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ' بی۔ اے اور ایم۔ اے کریں۔ یہاں وہ لازمی انگریزی' علوم طبعی (سائنس)' ریاضی فلسفہ اور معاشیات میں سے حسب مرضی مضامین لے سکتے ہیں۔ {۲۲}

معلّمِ مطلوب

عقل نظری کی تربیت ہو یا عقل عملی کی' تحصیل علم مقصود ہو یا سیرت کی تعمیر' استاد شاگرد پر سب سے زیادہ اہم اثر ڈالنے والی شخصیت ہے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ بچوں کی نشو و نما کے اصولوں سے بخوبی واقف ہو' اپنے مضمون پر پوری گرفت رکھتا ہو اور ساتھ ہی ساتھ مثالی عملی نمونے کا حامل ہو۔ اقبال اس سلسلہ میں فرماتے ہیں :

"معلم حقیقت میں قوم کے محافظ ہیں کیونکہ آئندہ نسلوں کو سنوارنا اور ان کو ملک کی خدمت کے قابل بنانا انہیں کی قدرت میں ہے۔ سب محنتوں سے اعلیٰ درجے کی محنت اور سب کارگزاریوں سے زیادہ بیش قیمت کارگزاری ملک کے معلموں کی کارگزاری ہے' اگرچہ بدقسمتی سے اس ملک میں اس مبارک پیشے کی وہ قدر نہیں ہے جو ہونی چاہئے۔ معلم کا فرض تمام فرضوں سے مشکل اور اہم ہے کیونکہ تمام قسم کی اخلاقی' تمدنی اور مذہبی نیکیوں کی کلید اس کے ہاتھ میں ہے۔ اور تمام قسم کی ملکی ترقی کا سرچشمہ اسی کی محنت ہے۔ پس تعلیم پیشہ اصحاب کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے پیشے کے تقدس اور بزرگی کے لحاظ سے اپنے طریق تعلیم کو

اعلیٰ درجے کے علمی اصولوں پر قائم کریں۔"{۲۳}

علامہ فرماتے ہیں ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی؟ {۲۴}

علامہ اقبال ایک مثالی معلم کے لئے مندرجہ ذیل صفات ضروری قرار دیتے ہیں۔

۱۔ خود شناس : علامہ کے نزدیک ایک معلم مطلوب میں یہ خصوصیت ہونی چاہئے کہ وہ اپنی خودی کی پہچان رکھتا ہو۔ وہ اپنے اور انسان کے مقام سے واقف ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ خود اپنی خودی سے آگاہ ہو گا تب ہی وہ اپنے طالب علم کے اندر یہ صفت پیدا کر سکے گا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ ؎

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام {۲۵}

۲۔ جلالی و جمالی : اقبال فرماتے ہیں :

"اسی طرح استاد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خودی کو جلالی اور جمالی' دونوں قوتوں سے مزین کرے۔ کیونکہ جب ہی جا کر وہ طلبہ کی فکری و جدانی تربیت کر سکے گا"۔ {۲۶}

بفحوائے کلام اقبال ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن {۲۷}

۳۔ حقیقت پسند : اقبال اپنے معلّم کو حقیقت پسند دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اسے رہبانیت کی بجائے معاشرے میں رہ کر' معاشرے کی ٹھوس حقیقتوں کے سامنے اپنا کردار ادا کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری {۲۸}

۴۔ متحرک ہستی : اقبال ایک ایسے معلم کا نقشہ پیش کرتے ہیں جو متحرک اور باعمل

جو ... آپ "مستحکم کردار" پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ آپ بچے کے چیخنے اور جھپٹ کر پلٹنے کو خون کی گرمی کا بہانہ قرار دیتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ استاد اپنی قوت کو تعمیری کاموں میں لگائے اور فطرت کے اصولوں کے مطابق بچوں کی نشوونما کا اہتمام کرے۔

علاوہ ازیں تدریسی فرائض کے دوران سنجیدگی، متوازن رویہ، وسعت مطالعہ، دلکش طرز تدریس، معلمانہ وقار، مشفقانہ برتاؤ، محنت و توجہ اور کسب حلال وغیرہ وہ خوبیاں ہیں جو معلم مطلوب کے کردار کا بنیادی حصہ ہیں۔

متعلّم مطلوب

اقبال علیہ الرحمہ طلبہ کے الحاد پرستانہ اور مذہب بیزار رویے سے نالاں تھے، آپ فرماتے ہیں۔ ؎

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ [۲۹]
اور یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف [۳۰]

چنانچہ آپ ایک مثالی طالب علم میں یہ خوبیاں دیکھنا چاہتے ہیں :

۱۔ شاہین صفت : اقبالؒ اپنے مثالی نوجوان کے لئے "شاہین" جیسی رمز بلیغ لاتے ہیں اور انھیں "شاہین" میں وہ تمام صفات جلیلہ و جمیلہ نظر آتی ہیں جو آپ کے شاہین میں موجود تھیں۔ بلند پروازی، حرکت و عمل، تھکن سے بے نیازی، نئے جہانوں کی تلاش اور اپنا شکار آپ کرنا وہ بنیادی خصوصیات تھیں جو اقبال کو اس پرندے میں بہت بھاتی تھیں اور انہی صفات کو اقبال اپنے نوجوانوں کی زندگی میں دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ ان مدارس سے بہت شکوہ کناں تھے جو بچوں کو بلند پروازی کی بجائے خاکبازی کا درس دیں۔ کہتے ہیں ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دیتے ہیں خاک بازی کا [۳۱]

۲ ۔ صاحب کتاب : اقبال' طالب علم کو کتابی کیڑا بننے کی بجائے صاحب کتاب بننے اور زندگی کے حقائق کا معروضی مشاہدہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں [۳۲]

۳ ۔ علم کا شائق : اقبال کہتے ہیں کہ طالب علم علم کا شائق ہو' اس میں علم حاصل کرنے کی تڑپ ہو۔ اسی مقصد کے تحت اقبال نے بچوں کے لئے ایک خوبصورت دعا لکھی جو اب بھی سکولوں میں "اسمبلی" کے وقت بچے مل کر پڑھتے ہیں۔ اِس دعا کا ایک ایک شعر' علم کی تڑپ اور شوق میں ڈوبا ہوا ہے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا مرے دَم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے
زندگی ہو میری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب [۳۳]

علاوہ ازیں علم کی طلب اور جنون کی حد تک اس کے اشتیاق کا عملی درس اقبال خود اپنی زندگی سے پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ جب آپ اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ تشریف لے جانے والے تھے تو حضرت محبوب الٰہی' نظام الدین اولیاء کے دربار اقدس پر حاضر ہوئے اور "التجائے مسافر" کے عنوان سے ایک خوبصورت دعائیہ نظم تحریر کی۔ اس میں آپ

فرماتے ہیں ؎

وطن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذّت کشاں کشاں مجھ کو {۳۴}

۴ ۔ دینی و مذہبی ذوق : اقبال علیہ الرحمہ سمجھتے تھے کہ اس الحاد پرستانہ اور مادی دور میں طلبہ کو دینی تعلیمات سے بہرہ مند کرنا بہت ضروری ہے۔ اقبال کی رائے یہ تھی کہ ماہرین مذہب اور ماہرین تعلیم کو اجتہادی کام سرانجام دینا چاہئے تاکہ مذہب کی تعلیمات' زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں بھی انسانی راہنمائی کر سکیں اور دور جدید کے نت نئے مسائل کا حل تلاش کرنے میں آسانی رہے۔

۵ ۔ پختگی کردار : اقبال علیہ الرحمۃ طلبہ کو بلند خودی اور پختگی کردار کی تلقین فرماتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں ؎

مصاف زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبّت میں حریرو پرنیاں ہو جا {۳۵}

آپ چاہتے تھے کہ طالب علم جسمانی اور روحانی طور پر مضبوط اور طاقتور ہو۔ "شاہین" کا استعارہ بھی گواہ ہے کہ اقبال طلبہ میں جسمانی مضبوطی کی طرح خودی' خود داری اور حرکت و عمل کا انتہائی جذبہ موجزن دیکھنا چاہتے تھے۔

۶ ۔ پیکرِ محبت : اقبال کے متعلّم مطلوب میں ایک اور اہم خوبی یہ ہونی چاہئے کہ وہ محبت و اخوت اور دوستی و بھائی چارے کا پیکر ہو۔ اقبال کا محبت کے بارے میں ایک واضح نقطہ نظر ہے۔ آپ فرماتے ہیں :

"محبت سے خودی مضبوط ہوتی ہے۔ یہ لفظ بہت وسیع معانی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی خواہش کو جذب کرنے کے ہیں اور اس کی اعلیٰ ترین صورت عرفان ہے جو انفرادیت پیدا کر سکتی ہے تو فرد اور خدا کے درمیان ایک نہ ختم ہونے والا تعلق قائم ہو جاتا ہے جس سے کردار میں پختگی آتی ہے۔"

تعلیمِ نسواں

اقبال علیہ الرحمۃ معاشرے میں عورت کے مقام سے بخوبی واقف تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ کائنات میں عورت کے وجود سے اور اس کی ذات سے رونق ہے اور اسی کے دم سے بقائے انسانیت کا راز وابستہ ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں {۳۶}

عورت اور اس کی تعلیم کی اہمیت کے بارے میں اقبال فرماتے ہیں :

"ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ تمدن کی جڑ کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور اپنی قوم کی عورتوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔ مرد کی تعلیم صرف ایک فرد واحد کی تعلیم ہے مگر عورت کو تعلیم دینا حقیقت میں تمام خاندان کو تعلیم دینا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی اگر اس قوم کا آدھا حصہ جاہل مطلق رہ جائے"۔ {۳۷}

مندرجہ بالا اقتباس سے بالکل واضح ہے کہ اقبال عورت کو جاہل رکھنے کے مخالف ہیں اور عورت کی تعلیم کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔ اس کے لئے وہ تین دلائل پیش کرتے ہیں :

۱۔ عورت تمدن کی جڑ ہے اور تمدن کی نشوونما' عورت کی تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

۲۔ مرد جو تعلیم حاصل کرتا ہے اس کا فائدہ بالعموم اس کی ذات تک محدود رہتا ہے جبکہ عورت اپنے بچوں کو تعلیم دے کر آئندہ نسلوں کو تعلیم یافتہ بنا سکتی ہے' یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب عورت خود تعلیم یافتہ ہو۔

۳۔ عورت کسی بھی قوم کا نصف حصہ ہوتی ہے۔ عورت کو تعلیم نہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ آدھی قوم جاہل اور اَن پڑھ رہ گئی ہے اس لئے بھی عورت کی تعلیم بے حد ضروری ہے۔

لیکن یہاں یہ سوال بہت اہم ہے کہ عورت کو کونسی تعلیم دی جانی چاہئے۔ یہ سوال حضرت اقبال خود اٹھاتے ہیں :

"اس ضمن میں ایک غور طلب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مشرقی عورتوں کو مغربی طریق کے مطابق تعلیم دی جائے یا کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے ان کے شریفانہ اطوار' جو مشرقی دل و دماغ کے ساتھ خاص ہیں' قائم رہیں"۔ {۳۸}

پھر سوال کا جو جواب اقبال نے تجویز کیا وہ یہی تھا کہ

"لڑکیوں کو ابتداء میں مذہبی تعلیم دی جائے اور اس کے بعد انہیں اسلامی تاریخ' علم تدبیر خانہ داری اور علم اصول حفظان صحت پڑھایا جائے جس سے ان کی دماغی صلاحیتیں اس حد تک نشو و نما پا جائیں گی کہ وہ اپنے شوہروں سے تبادلہ خیالات کر سکیں گی اور وہ تمام فرائض جو عورت کے فرائض اولین کہے جا سکتے ہیں' حسن و خوبی سے انجام دینے کے قابل ہو جائیں گی۔

وہ تمام مضامین جو عورت کی نسوانیت کی نفی کرتے ہوں یا اسے اسلام کی حلقہ بگوشی سے آزاد کروانے والے ہوں وہ نصاب تعلیم سے خارج کر دینے پر اقبال رحمتہ اللہ نے بہت زور دیا ہے۔ نیز مخلوط تعلیم کے لئے اقبال کسی قیمت پر تیار نہ تھے"۔ {۳۹}

ایک اور جگہ پر اقبال تعلیم نسواں کے متعلق رائے دیتے ہوئے فرماتے ہیں

جس علم کی تاثیر سے زَن ہوتی ہے نازَن
کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت
بے گانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت {۴۰}

ان اشعار سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں :

۱۔ عورتوں کو تعلیم اس انداز سے بالکل نہیں دی جانی چاہئے جس سے ان کی نسوانیت ختم ہو اور وہ "زن" سے "نازن" بن جائیں۔

۲۔ "مدرسۂ زن" یعنی عورتوں کے تعلیمی اداروں کو یا دوسرے لفظوں میں عورتوں کی تعلیم کو دین سے بیگانہ بالکل نہیں ہونا چاہئے۔

بہرکیف تعلیم نسواں کے متعلق علامہ کی جامع ترین رائے یہ ہے کہ :

"ایک قوم کی حیثیت سے ہمارے استحکام کا انحصار مذہبی اصولوں کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہنے پر ہے۔ جس لمحہ یہ گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ شاید ہمارا حشر یہودیوں جیسا ہو جائے۔ تو پھر ہم اس گرفت کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ کسی قوم میں مذہب کا محافظ خاص (Principal Depository) کون ہوتا ہے؟ عورت اور صرف عورت! اسی لئے مسلمان عورت کو عمدہ معقول و معتبر دینی تعلیم ملنی چاہئے کیونکہ وہی فی الواقعی قوم کی معمار ہے۔ میں مطلقاً آزاد طریقہ تعلیم (Absolute System of Education) کا قائل نہیں ہوں۔ دیگر تمام امور کی طرح طریقہ تعلیم کا تعین بھی ایک قوم کی ضروریات کے ماتحت ہونا چاہئے۔ ہمارے مقصد کے لئے مسلمان لڑکیوں کی دینی تعلیم کافی ہے"۔ {۴۱}

مروّجہ نظام تعلیم پر تنقید

برصغیر پاک و ہند پر انگریزوں کی حکومت کے قیام سے مسلمانوں کو جو اور بہت سے خطرات درپیش ہوئے' ان میں سے ایک اہم خطرہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کی تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست نہیں تھا۔ اس خطرے کو سب سے پہلے سرسید احمد خان نے محسوس کیا اور اس کا حل یہ تجویز کیا کہ مسلمانوں کو اپنی دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم سے بھی آراستہ ہونا چاہئے۔ یوں برصغیر کے مسلمانوں کو تعلیم جدید سے روشناس کرانے کا سہرا سرسید احمد خان کے سر ہے۔ اقبال' سرسید کے اس خیال سے متفق تھے۔ "بانگ درا" کی ایک نظم میں اقبال' سرسید احمد خان کو "مرشد اور رہبر" کے القاب سے یاد کرتے ہوئے آپ کی تعلیمی تحریک کا ذکر کرتے ہیں۔ اس خوبصورت نظم میں اقبال' سرسید کی تعلیمی تحریک کو "فرمانِ خضر" سے تعبیر کرتے ہیں اور نظم کے آخری شعر میں آپ کی تحریک کا ساتھ دینے اور اس پر عمل پیرا ہونے کو واجب قرار دیتے ہیں۔

مرشد کی یہ تعلیم ہے اے مسلمِ شوریدہ سر — لازم ہے رہرو کے لئے دنیا میں سامان سفر
بدلی زمانہ کی ہوا' ایسا تغیر آ گیا — تھے جو گراں قیمت کبھی' اب ہیں متاع کس مخر
وہ شعلہ روشن ترا' ظلمت گریزاں جس سے تھی — گھٹ کر ہوا مثل شرر تارے سے بھی کم نور تر

شیدائی غائب نہ رہ، دیوانہ موجود ہو — غالب ہے اب اقوام پر معبود حاضر کا اثر
ممکن نہیں اس باغ میں کوشش ہو باآور تیری — فرسودہ ہے پھندا ترا زیرک ہے مرغ تیز پر
اس دور میں تعلیم ہے امراض ملت کی دوا — ہے خون فاسد کے لئے تعلیم مثل نیشتر
رہبر کی ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے — واجب ہے صحرا گرد پر تعمیل فرمان خضر {۴۲}

لیکن خالص مغربی تعلیم اور مذہبی تعلیم کے بغیر حاصل کی جانے والی جدید تعلیم سے آپ سخت نالاں بھی تھے۔ اقبال کے نزدیک جدید تعلیم کی خرابیاں یہ ہیں۔

بے ادبی و بدتمیزی

اقبال کے خیال میں موجودہ جدید تعلیم کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ نوجوان نسل کو بے ادب اور بدتمیز بنا رہی ہے۔ وہ اکبر الہ آبادی کے طنزیہ اور ظریفانہ انداز میں کہتے ہیں۔

تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض — دل چاہتا تھا ہدیہ دل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق — کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بل پیش کیجئے" {۴۳}

شیخی خوری

اس جدید تعلیم نے نوجوان کو نہ صرف بے ادب اور بدتمیز بلکہ شیخی خور بھی بنا دیا ہے ؎

تعلیم مغربی ہے بہت جرات آفریں — پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج میں مارڈینگ {۴۴}

اقبال، نوجوانوں کی بے ادبی، بدتمیزی، بے جا غرور و تعلی سے دل گرفتہ ہیں۔

بے جا نمود و نمائش

اقبال علیہ الرحمہ کو جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں سے سب سے بڑا شکوہ یہ تھا کہ جدید تعلیم نے نوجوانوں کو ظاہری نمود و نمائش پر جان دینے والا، عیش کوش و عشرت پسند، تن آسان اور آرام طلب بنا دیا ہے۔

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے، جوانوں کو تن آسانی

امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی {۴۵}

سوز و گداز سے خالی

اقبال علیہ الرحمہ کے خیال میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ جوان' خلوص و محبت سوز و گداز اور ایثار و قربانی کے لطیف و پاکیزہ جذبات سے خالی ہیں

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے
وہ آنکھ کہ ہے سرمہ افرنگ سے روشن پُرکار سخن ساز ہے' نمناک نہیں ہے {۴۶}

محبت و معرفت کی کمی

اقبال مروجہ تعلیم سے اس لئے بھی خفا ہیں کہ وہ طلبہ میں محبت و معرفت پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں ؎

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی' نہ محبت' نہ معرفت نہ نگاہ {۴۷}

وہ اس تلخ حقیقت پر سخت غمگین تھے کہ جدید تعلیم نے آوازۂ حق و صداقت کو بلند کرنے کا درس دینے کی بجائے نوجوانوں کو مصلحت پسندی کا عادی بنا دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ {۴۸}

آپ ایک خطبہ میں فرماتے ہیں :

"عصر حاضر کی ذہنی سرگرمیوں میں جو نتائج مرتب ہوئے' ان کے زیر اثر انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے' یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ زندگی کے اعلیٰ مراتب کے لئے اس کی جد و جہد بتدریج ختم ہو رہی ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ درحقیقت زندگی ہی سے اکتا چکا ہے۔" {۴۹}

الحاد و بے دینی

اقبال کو نوجوانوں کی تعلیم جدید سے ایک گلہ یہ بھی تھا کہ وہ انہیں دین' مذہب' خدا

اور احکاماتِ خدا سے دُور لئے جارہی تھی اور ان کے دلوں میں الحاد پرستی اور بے دینی کے بیج بوئے جارہی تھی۔ اسی لئے آپ اس نظام تعلیم کو ایک سازش قرار دیتے ہیں ؎

اور یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف {۵۰}

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔ ؎

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ {۵۱}

مروّجہ دینی تعلیم پر تنقید

علامہ اقبال اسلامی مدارس میں دی جانے والی نام نہاد دینی تعلیم سے بھی نالاں تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ تعلیم اور اس کا طریقہ تدریس فرسودہ ہو چکے ہیں اور عصر جدید کے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے سے قاصر ہیں۔ اسی لئے اقبال کے نقطہ نظر کو واضح کرتے ہوئے بختیار حسین صدیقی لکھتے ہیں :

"جہاں تک روحانیت کا تعلق ہے' کہا جاسکتا ہے کہ قدیم دینیات فرسودہ خیالات کی حامل ہے اور جہاں تک تعلیمی حیثیت کا تعلق ہے جدید مسائل کے طلوع اور قدیم مسائل کی طرح نو کے مقابلے میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اسی لئے اقبال ایک نئی دینیات اور کلام کی تعمیر و تشکیل کے خواہاں تھے۔" {۵۲}

یوں آپ کے نظریات و افکار کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال جدید تعلیم کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیم کے مروجہ دینی نظام سے بھی نالاں تھے۔ ایک کو اگر وہ "زندگی و محبت" سے خالی قرار دیتے ہیں تو دوسرے یعنی دینی نظام تعلیم کو "معرفت و نگاہ" سے عاری سمجھتے ہیں۔ اسی لئے آپ فرماتے ہیں ؎

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی' نہ محبت' نہ معرفت' نہ نگاہ {۵۳}

دراصل اقبال کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ دینی تعلیم انسان کو معرفت خدا سے، عشق حقیقی کی لذتوں سے اور کائنات رنگ و بو کے اسرار و رموز سے آشنا کردے۔ لیکن جب آپ اپنے گرد و پیش میں دینی تعلیم کے مدارس میں ان مقاصد کو پایہ تکمیل تک پہنچتا ہوا نہ دیکھتے تھے اور انہیں فروعی مسائل کی لاحاصل بحث میں الجھا ہوا پاتے تھے تو ناپسندیدگی اور اکتاہٹ کی کیفیت کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ اسی لئے آپ فرماتے ہیں ؎

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے؟
خانقاہوں میں کہیں لذّتِ اَسرار بھی ہے؟ {۵۴}

مذہب اور سائنس

سائنس، منظم، درست اور تجرباتی و مشاہداتی علم کا نام ہے۔ سائنس سے بالعموم ہم علوم جدیدہ مراد لیتے ہیں۔ سائنس کا وہ پہلو جو کائنات، چاند، ستاروں اور سیاروں وغیرہ کو مسخر کرنے اور ان کے بھید معلوم کرنے کے متعلق ہے اقبال اس کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے اور اُسی کے داعی تھے۔ آپ فرماتے ہیں ؎

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک {۵۵}

اسی انداز میں ایک مقام پر اس امر کی طرف قدرے شدت سے اشارہ کرتے ہیں

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے {۵۶}

آپ سائنس کو مذہبی یا اسلامی تعلیمات سے جدا یا متصادم نہیں سمجھتے تھے، بلکہ مذہب اور سائنس کے تصادم کا تصور ہی باطل ہے۔ ۴/ مارچ ۱۹۲۸ء کو اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت علامہ اقبال نے فرمائی۔ اپنے صدارتی خطبے میں علامہ اقبال نے فرمایا :

"مذہب، فلسفہ، طبیعیات اور دیگر علوم و فنون سب کے سب مختلف راستے

ہیں جو ایک ہی منزل مقصود پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ مذہب اور سائنس کے تصادم کا خیال اسلامی نہیں کیونکہ سائنس یعنی علوم جدیدہ اور فنون حاضرہ کے باب کھولنے والے تو مسلمان ہی ہیں اور اسلام ہی نے انسان کو منطق کا استقرائی طریق سکھایا اور علوم کی بنیاد نظریات اور قیاسات پر رکھنے کے طریق کو مسترد کرنے کی تعلیم دی۔ اور یہی بات علوم جدیدہ کی پیدائش کا موجب ہوئی۔ سائنس اور مذہب کے تصادم کا خیال غیر اسلامی ہے۔ قرآن کریم کے ہر صفحہ پر انسان کو مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعے علم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور منتہائے نظر یہ بتایا گیا ہے کہ قوائے فطرت کو مسخر کیا جائے۔ چنانچہ قرآن کریم تو صاف الفاظ میں انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر وہ قوائے فطرت پر غلبہ حاصل کر لیں تو ستاروں سے بھی پرے پہنچنے کے قابل ہو جائیں گے۔" {۵۷}

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں {۵۸}

ایک اور مقام پر آپ فرماتے ہیں ؎

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تُو ہے {۵۹}

(جاری ہے)

حواشی

{۱} خلیفہ عبدالحکیم : فکر اقبال' ص ۵۹۲۔۵۹۳
{۲} نیاز فتح پوری : اقبال کا فلسفہ خودی
{۳} ڈاکٹر علامہ محمد اقبال : تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' ترجمہ نذیر نیازی' ص ۱۵۔۱۶
{۴} علامہ محمد اقبال : بال جبریل' کلیات اقبال' ص ۳۲۰
{۵} ڈاکٹر علامہ محمد اقبال : تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' ترجمہ نذیر نیازی' ص ۱۹۶۔۱۹۷
{۶} محمد احمد صدیقی : اقبال کے تعلیمی نظریات' ص ۲۳
{۷} محمد احمد صدیقی : اقبال کے تعلیمی نظریات' ص ۲۳
{۸} محمد جاوید نقشبندی : علامہ اقبال اور علامہ طاہر القادری کے تعلیمی نظریات کا موازنہ' ص ۲۷

{۹} علامہ محمد اقبال : ضرب کلیم ،کلیات اقبال ،ص ۴۸۸
{۱۰} محمد احمد صدیقی : اقبال کے تعلیمی نظریات ،ص ۱۷۵-۱۷۶
{۱۱} غلام السیدین : اقبالز ایجوکیشنل فلاسفی ،ص ۹۹
{۱۲} غلام السیدین : اقبالز ایجوکیشنل فلاسفی ،ص ۹۹
{۱۳} علامہ ڈاکٹر محمد اقبال علیہ الرحمہ اور علامہ ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے تعلیمی نظریات کا موازنہ ،ص ۳۷، ۶۳
{۱۴} اقبالز ایجوکیشنل فلاسفی ،ص ۳۳۴
{۱۵} تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ،ص ۲۰
{۱۶} علامہ اقبال : بانگ درا ،کلیات اقبال ،ص ۲۷۸
{۱۷} اقبالؒ اور مسئلہ تعلیم ،ص ۳۳۸
{۱۸} اقبال کا نظریہ تعلیم ،ص ۱۴ تا ۱۷
{۱۹} اقبال بحیثیت مفکر تعلیم ،ص ۲ تا ۲۲
{۲۰} علامہ اقبال : ضرب کلیم ،کلیات اقبال ،ص ۵۴۵
{۲۱} محمد فاروق جوش : اقبال اور تعلیم ،ص ۱۱۶
{۲۲} اقبال رحمتہ اللہ علیہ اور مسئلہ تعلیم ،ص ۴۰۵ تا ۴۱۲
{۲۳} عبدالواحد معینی : مرتب ،مقالات اقبال ،ص ۹
{۲۴} علامہ اقبال : بال جبریل ،کلیات اقبال ،ص ۳۰۶
{۲۵} علامہ محمد اقبال : ضرب کلیم ،کلیات اقبال ،ص ۴۸۶
{۲۶} محمد جاوید نقشبندی : علامہ ڈاکٹر محمد اقبال اور علامہ ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے تعلیمی نظریات کا موازنہ ،ص ۵۷
{۲۷} علامہ محمد اقبال : ضرب کلیم ،کلیات اقبال ،ص ۵۰۷
{۲۸} علامہ محمد اقبال : ارمغان حجاز ،کلیات اقبال ،ص ۶۸۰
{۲۹} علامہ محمد اقبال : بانگ درا ،کلیات اقبال ،ص ۲۰۹
{۳۰} علامہ محمد اقبال : بانگ درا ،کلیات اقبال ،ص ۲۰۹
{۳۱} علامہ محمد اقبال : بال جبریل ،کلیات اقبال ،ص ۲۶۰
{۳۲} علامہ محمد اقبال : ضرب کلیم ،کلیات اقبال ،ص ۴۵۰
{۳۳} علامہ محمد اقبال : بانگ درا ،کلیات اقبال ،ص ۲۳

{۳۴} ایضاً " " " ص ۷۰
{۳۵} ایضاً " " " ص ۲۱۶
{۳۶} علامہ محمد اقبال : ضرب کلیم، کلیات اقبال، ص ۴۶۰
{۳۷} بختیار حسین صدیقی : اقبال بحیثیت مفکر تعلیم، ص ۱۰۵
{۳۸} سید عبدالواحد، معینی، مقالات اقبال، ص ۵۷
{۳۹} اقبال کا نظریہ تعلیم، ص ۲۲
{۴۰} علامہ محمد اقبال : ضرب کلیم، کلیات اقبال، ص ۴۶۱
{۴۱} بحوالہ : اقبال اور مسئلہ تعلیم، ص ۴۷۰-۴۷۱
{۴۲} علامہ محمد اقبال : بانگ درا، کلیات اقبال، ص ۱۸۹-۱۹۰
{۴۳} علامہ محمد اقبال، بانگ درا، کلیات اقبال، ص ۲۲۵
{۴۴} علامہ محمد اقبال : بانگ درا، کلیات اقبال، ص ۲۲۵
{۴۵} علامہ محمد اقبال : بال جبریل، کلیات اقبال، ص ۴۱۱
{۴۶} علامہ محمد اقبال : بال جبریل، کلیات اقبال، ص ۳۲۵
{۴۷} علامہ محمد اقبال : بال جبریل، کلیات اقبال، ص ۳۳۸
{۴۸} ایضاً
{۴۹} تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۲۸۹-۲۹۰
{۵۰} علامہ محمد اقبال : ضرب کلیم، کلیات اقبال، ص ۵۴۸
{۵۱} علامہ محمد اقبال : بانگ درا، کلیات اقبال، ص ۲۰۹
{۵۲} اقبال علیہ الرحمہ کے تعلیمی نظریات، ص ۵۳
{۵۳} علامہ محمد اقبال : بال جبریل، کلیات اقبال، ص ۳۳۸
{۵۴} علامہ محمد اقبال : بال جبریل، کلیات اقبال، ص ۳۵۶
{۵۵} علامہ محمد اقبال : بال جبریل، کلیات اقبال، ص ۳۵۸
{۵۶} علامہ محمد اقبال : بال جبریل، کلیات اقبال، ص ۳۵۸
{۵۷} علامہ محمد اقبال اور علامہ محمد طاہر القادری کے تعلیمی نظریات کا موازنہ، ص ۶۳
{۵۸} علامہ محمد اقبال : بال جبریل، کلیات اقبال، ص ۳۵۳
{۵۹} علامہ محمد اقبال : بانگ درا، کلیات اقبال، ص ۲۶۹

جشن نزول قرآن

قرآن اکیڈمی' کراچی میں
محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا دورۂ ترجمہ قرآن

یہ ۱۵/ ستمبر ۹۷ء کی شب تھی۔ لاہور میں ایک مشاورتی اجلاس میں شرکت کے بعد واپسی کے لئے گاڑی میں سوار ہوا ہی چاہتا تھا کہ آواز آئی "نوید بھائی" دیکھا تو یہ برادرم آصف حمید تھے۔ نگران انجمن ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے "سب سے چھوٹے" صاحب زادے--وہ مجھے ایک طرف کو لے گئے اور سرگوشی کرنے لگے :

"ابّی اِس سال رمضان المبارک میں دورۂ ترجمہ قرآن کرنے اور اس کی ایسی ویڈیو ریکارڈنگ کرانا چاہتے ہیں جو سیٹلائیٹ کے ذریعہ بھی نشر کی جا سکے۔ قرآن اکیڈمی لاہور کے اطراف میں ٹریفک کا شور بہت زیادہ ہے اور یہاں ریکارڈنگ میں خلل واقع ہونے کا اندیشہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ ریکارڈنگ مسجد جامع القرآن' قرآن اکیڈمی کراچی میں ہو"۔

برادرم آصف حمید کی خواہش کا سن کر میرے وجود میں خوشی و شادمانی کی لہر دوڑ گئی اور ایسا جوش و خروش پیدا ہوا کہ کراچی آتے ہی میں نے یہ تجویز شیخ جمیل الرحمٰن صاحب مدّظلہٗ کے سامنے رکھی۔ نتیجتاً انہوں نے ڈاکٹر صاحب موصوف سے کراچی میں دورۂ ترجمہ قرآن کرنے کی درخواست ایک ایسے مدلل خط کے ذریعہ کی کہ ڈاکٹر صاحب نے بلا تأمل شیخ صاحب کی درخواست کو منظور فرمالیا۔

ڈاکٹر صاحب سے منظوری حاصل ہوتے ہی شیخ صاحب نے دورۂ ترجمہ قرآن کے انعقاد کے لئے جملہ انتظامات کا خاکہ بنایا اور انجمن خدام القرآن سندھ کی مجلس منتظمہ سے اس کی منظوری حاصل کی۔ ان انتظامات کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اور عبدالواحد عاصم صاحب کمیٹی کے ناظم مقرر ہوئے۔

دورۂ ترجمہ قرآن کے حوالے سے ابتدائی اور سب سے اہم کام اس کی تشہیر کا تھا۔

راقم نے شیخ صاحب کی راہنمائی میں تشہیری مواد تیار کیا' صدر انجمن عبداللطیف عقیلی صاحب اور عبدالواحد عاصم صاحب سے منظوری حاصل کی اور اب اسے عوام الناس تک پہنچانا تھا۔ امیر تنظیم اسلامی حلقہ سندھ بلوچستان جناب نسیم الدین صاحب کی قیادت میں رفقائے تنظیم اسلامی نے بھرپور محنت کی۔ تمام پوسٹرز چسپاں کر دیئے گئے اور ہینڈ بلز دستی یا بذریعہ ڈاک لوگوں تک پہنچائے گئے۔ اس کے علاوہ ایک ہزار خطوط کے ذریعہ ذاتی طور پر اراکین و وابستگان انجمن کو اس پروگرام سے آگاہ کیا گیا۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مذکورہ بالا تمام اکابر اور ساتھیوں کی اس محنت کو مقبول و منظور فرمائے اور اسے ان سب کے حق میں توشہ آخرت بنائے۔ آمین

بحمد اللہ دورۂ ترجمہ قرآن کے انعقاد کے لئے تمام انتظامات اپنے اپنے وقت پر پایہ تکمیل کو پہنچے اور ڈاکٹر صاحب موصوف رمضان المبارک سے تین روز قبل یعنی ۲۷ دسمبر ۹۷ء کو کراچی تشریف لے آئے۔ اسی روز دورۂ ترجمہ قرآن کی اہمیت واضح کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے جامع مسجد خضراء صدر کراچی میں "عظمتِ قرآن" اور "عظمتِ صوم" کے موضوعات پر خطابات فرمائے۔ حاضری توقع کے مطابق نہیں تھی لیکن شہر کی فرقہ وارانہ کشیدگی اور امن و امان کے حوالے سے مخدوش صورت حال کے پیش نظر کافی حد تک مناسب تھی۔ ان موضوعات پر قبلہ ڈاکٹر صاحب بارہا خطاب فرما چکے ہیں لیکن اس بار آپ نے جس نئے انداز اور نئے دلائل سے موضوعات کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کیا تو اس پر سابق صدر انجمن زین العابدین جواد صاحب نے کیا خوب تبصرہ کیا کہ ع

"اِک پھول کا مضمون ہو تو "ڈیڑھ" سو رنگ سے باندھوں"

۲۸ اور ۲۹ دسمبر کو محترم ڈاکٹر صاحب نے مسجد جامع القرآن قرآن اکیڈمی کراچی میں "تعارف قرآن" کے موضوع پر دو دو گھنٹے کے خطابات ارشاد فرمائے اور بالآخر ۳۰/ دسمبر کو وہ مبارک شب آن پہنچی جس کا بڑے دنوں سے انتظار تھا یعنی رمضان المبارک کی پہلی شب۔ اور پھر نفوس کو گرمانے' دلوں کو لرزانے اور تن بدن میں جوش ایمانی پیدا کرنے والے سعید و بابرکت سلسلے یعنی دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز ہو گیا۔ مسجد جامع القرآن وسیع و عریض شہر کراچی کے بالکل ہی کنارے یعنی ساحل سمندر پر واقع ہے

اور شہر سے یہاں تک رسائی کوئی آسان کام نہیں۔ اِسی لئے ترجمہ قرآن حکیم سننے کا ذوق وشوق رکھنے والوں کے لئے وابستگان دعوت رجوع اِلی القرآن نے شہر کے مختلف حصوں سے قرآن اکیڈمی پہنچنے کے لئے پانچ بسوں کا انتظام کر رکھا تھا۔ بہت سے حضرات و خواتین اپنے طور پر بھی محافل ترجمہ قرآن میں شرکت کے لئے آتے رہے۔ ہر شب ابتداء میں حضرات و خواتین کی تعداد ۴۰۰ سے متجاوز رہی تھی' البتہ شب کے آخری حصہ تک اس سے نصف کی تعداد میں حضرات و خواتین موجود رہتے تھے۔ ۶۲ حضرات و خواتین نے کلام ربانی کا ترجمہ پورے اہتمام وانہماک سے سننے کے لئے رب کریم کے اس گھر یعنی مسجد جامع القرآن' قرآن اکیڈمی میں مستقل ڈیرہ لگا دیا تھا۔ ان میں شہر کراچی کے علاوہ ملک کے دیگر حصوں اور بیرون ملک سے آنے والے حضرات و خواتین بھی شامل تھے۔ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں' جو بموجب ارشاد نبی کریم ﷺ آتش دوزخ سے نجات کا عشرہ ہے' شرکاء کی تعداد دو سے ڈھائی چند ہو گئی تھی۔

ہر شب ترجمہ قرآن کا آغاز تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ہوتا تھا اور یہ سلسلہ ڈھائی بجے کے قریب اختتام پذیر ہوتا تھا۔ محترم ڈاکٹر صاحب کی عمر باسعادت شمسی اعتبار سے ۶۶ برس ہونے کو ہے۔ کئی عوارض و معذوریاں ان کو لاحق ہیں لیکن اس سب کے باوجود محنت و مشقت اور استقامت کے اس کوہ ہمالیہ کا قرآن حکیم کے ساتھ شغف' ذوق وشوق اور الفت و محبت دیدنی اور قابل رشک تھا۔ پھر حاضرین کی کثیر تعداد اور ان کی طرف سے بڑی توجہ وانہماک کے ساتھ ترجمہ قرآن حکیم کی سماعت کے عالم نے ایسا سماں باندھ دیا تھا جس نے ڈاکٹر صاحب کے جذبات و احساسات کو اور جلا بخش دی تھی۔ ہر شب ہمت و عزیمت کے پیکر اس محب و خادم قرآن نے بیان القرآن کے لئے جس طرح چار سے پانچ گھنٹے کی مشقت برداشت کی اسے دیکھ کر بے ساختہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اُدھر رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی آمد آمد تھی اور اِدھر مسجد جامع القرآن میں مسنون اعتکاف کی خواہش رکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ در اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

مسجد جامع القرآن باوجود اپنی کشادگی کے، تنگی داماں کی شکایت کرنے لگی اور مجبوراً اِعتکاف کے خواہش مند کئی حضرات سے معذرت کرنی پڑی۔ جن حضرات کو یہاں اعتکاف کی سعادت نصیب ہوئی ان کی تعداد ۱۴۸ تھی۔ اس کے علاوہ ۴۵ خواتین بھی معتکفین میں شامل تھیں۔ بعد ازاں مزید ۱۴ حضرات بھی نفلی اعتکاف کے لئے مسجد جامع القرآن تشریف لے آئے۔ کارکنان انجمن نے جس خوبصورتی سے معتکفین کے لئے حجرے بنائے تھے وہ ان کی حسن کارکردگی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل ۲۶ ویں شب میں ہوئی۔ اس شب حضرات و خواتین کی تعداد ۱۸۰۰ سے متجاوز تھی جو کارکنان انجمن کی توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ترجمہ قرآن کی تکمیل فرمائی اور بفضلہٖ تعالیٰ صلوٰۃ التروایح میں ختم القرآن کے بعد شرکاء کو صاحب خیر حضرات کی طرف سے شیرینی کے علاوہ آخری پارہ کی انتہائی موثر اور دلسوز تلاوت کا کیسٹ ہدیتاً پیش کیا گیا۔ البتہ اس شب کا سب سے عظیم تحفہ بڑی خوب صورت طباعت میں وہ مسنون و ماثور دعا تھی جس میں نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام نے کمال عاجزی و انکساری کے اظہار اور رب کریم کو ان کے تمام اسمائے حسنیٰ کا واسطہ دے کر سوال کیا ہے کہ "اَللّٰھُمَّ اجْعَلِ الْقُرآنَ رَبِیعَ قَلْبِی ـــــ وَ ـــــ نُورَ صَدْرِی وَجَلاءَ حُزنِی ـــــ وَ ـــــ ذَھابَ ھَمِّی وَغَمِّی" "اے اللہ تو قرآن کو بنادے ـــــ میرے دل کی بہار ـــــ اور ـــــ میرے سینے کا نور ـــــ اور میرے دکھ کا مداوا ـــــ اور ـــــ میرے تفکرات و غموں کا ازالہ"۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے التجا ہے کہ وہ اس دعا کو ہم سب کے حق میں بھی شرف قبولیت عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین

ختم القرآن کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے "دعوتِ قرآنی کا خلاصہ" کے موضوع پر اثر انگیز خطاب فرمایا اور دعوت قرآنی پر لبیک کہنے والوں سے تنظیم اسلامی کی رفاقت کے لئے مسنون و ماثور بیعت لی۔ بعد ازاں جب ڈاکٹر صاحب امام شافعیؒ کے طریقہ سے صلوۃ الوتر کی امامت کے لئے کھڑے ہوئے تو بے اختیار یہ شعر بار بار زبان پر آنے لگا کہ ؎

وہ وقت آیا کہ ہم کو قدرت ہماری سعی و عمل کا پھل دے
بتا رہی ہے یہ ظلمتِ شب کہ صبح نزدیک آ رہی ہے

صلوٰۃ الوتر کے آخر میں جب ڈاکٹر صاحب نے رقت آمیز دعا سے حاضرین کے وجود کو لرزایا' نفوس کو گرمایا اور قلوب کو تڑپایا تو ایسا محسوس ہوا کہ یہ گھڑی پورے ماہ کی محافل قرآنی کا نقطۂ عروج ہے' اور وہ وقت آگیا ہے کہ مالک ارض و سماء سے صیام و قیام کی سعادتیں حاصل کرنے والے لوگ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے عین مطابق پہلے عشرہ کی رحمتیں' دوسرے عشرہ کی بخششیں اور تیسرے عشرہ کی آتش دوزخ سے نجات کی خیرات کثیرات طلب کرلیں۔

دورۂ ترجمہ قرآن کے ساتھ ساتھ تراویح میں ترتیل کے ساتھ تلاوت قرآن کر کے حافظ مقبول صاحب نے واقعتاً نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ پھر فجر اور عشاء میں جس طرح حافظ صاحب نے آیات قرانیہ میں پنہاں ملکوتی غناء اور صوتی آہنگ کو خوب خوب ظاہر و نمایاں کیا اس پر قلب کی گہرائیوں سے ان کے حق میں یہ دعا نکلی : اَللّٰھم زِدْہُ فَزِدْ !!

دورۂ ترجمہ قرآن کی ریکارڈنگ کے لئے برادرم آصف حمید اور ان کے کارکنان نے جس توجہ کے ساتھ محنت کی' دعا ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ اسے ان کے حق میں بہت بڑے صدقہ جاریہ کا سبب بنادے۔ اس پروگرام کے شرکاء کو مختلف سہولیات فراہم کرنے کے لئے برادرم عبدالرحمٰن ہنگورہ صاحب اور ان کے ساتھیوں کو جو انتھک محنت کرنا پڑی وہ بھی یقیناً حسابات خداوندی میں محفوظ ہو گئی ہے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے امید واثق ہے کہ وہ ان سب کو اس کا اجر عظیم مرحمت فرمائیں گے۔

آخر میں خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی جملہ دینی مساعی کو مقبول و منظور فرمائے اور ہم سب کو ان جیسی استقامت عطا فرمائے تاکہ ان کی طرح عمر کے آخری حصہ میں ہم بھی کہہ سکیں کہ ؏

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم!

(مرتب : انجینئر نوید احمد)

قرآن اکیڈمی لاہور میں دورۂ ترجمہ قرآن

امیر محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے نماز تراویح کے دوران دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز ۱۹۸۴ء میں مسجد جامع القرآن' قرآن اکیڈمی لاہور میں فرمایا تھا۔ اُس وقت سے یہ سلسلہ بغیر کسی تعطل کے جاری ہے۔ چنانچہ مختلف اصحاب اِس مسجد میں یہ ذمہ داری ادا کرتے رہے ہیں۔ سال ۱۹۹۸ء میں اس کی سعادت جناب خالد محمود عباسی کو نصیب ہوئی جو تنظیم اسلامی حلقہ آزاد کشمیر کے ناظم اور قرآن کالج کے گریجویٹ ہیں۔ ان کی اہلیت و صلاحیت کو شرکاء دورۂ ترجمہ قرآن نے خوب سراہا۔ یہ پروگرام روزانہ آٹھ بجے سے شروع ہو کر تقریباً ڈیڑھ بجے تک ہوتا رہا۔ شرکاء کی تعداد ۱۰۰ سے ۱۵۰ کے درمیان رہی جبکہ آخری عشرہ میں اس میں کافی اضافہ ہوا۔

خالد محمود عباسی نے پروگرام کو شروع سے لے کر آخر تک نہایت محنت اور خوش اسلوبی سے نبھایا۔ بعض مقامات کے ترجمہ کے دوران انہوں نے تفصیلاً تنظیم اسلامی کی دعوت پیش کی۔ دورۂ ترجمہ قرآن کا یہ پروگرام ۲۶/ رمضان المبارک کو اختتام پذیر ہوا۔ ۲۷ ویں شب نماز تراویح کے بعد امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے "موجودہ صورت حال میں مسلمانان پاکستان کے لئے راہنمائی" کے موضوع پر خطاب کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہر شخص کو کسی ایسی جماعت میں لازماً شامل ہو کر اپنا کردار ادا کرنا چاہئے جو اس کے فہم کے مطابق پاکستان میں اسلام کے عملی نفاذ کے لئے کام کر رہی ہو۔ اس خطاب کی بدولت ۲۹ ویں شب ۱۱/ افراد نے محترم ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر کے تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔ (مرتب : محمود عالم میاں)

تبصرہ کتب

استنبول سے رباط تک

مولف : ڈاکٹر عمران این حسین' ترجمہ و تلخیص : محمد سردار اعوان
ناشر : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' صفحات : ۱۱۰' قیمت : ۳۰ روپے
تبصرہ نگار : حافظ محمد سجاد تنزالوی

خلافت اسلامیہ' امت مسلمہ کے اتحاد و یک جہتی کا ایک نمائندہ ادارہ رہا ہے اور اس کے ساتھ مسلمانوں کی دینی و دنیاوی ہر لحاظ سے وابستگی رہی ہے۔ خلافت بنو امیہ و بنو عباس کا عہد' قطع نظر اس سے کہ اس میں خلافت راشدہ جیسی خصوصیات نہ تھیں' وحدت امت کا نقیب رہا۔ اسی دوران میں آٹھویں' نویں' دسویں صدی عیسوی میں جبکہ اسلام کی علمبرداری اور عالم اسلام کی سیادت بنو امیہ و بنو عباس کے پاس تھی' روئے ارضی کے ایک بڑے حصے پر ان کے دین و مذہب' ان کی تہذیب و تمدن' ان کے علوم و فنون اور شان و شوکت کا سکہ رواں رہا۔

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں امت مسلمہ کمزور ہونا شروع ہوئی۔ ایک طرف صلیبی طوفان کے ریلے آنے شروع ہوئے' اور ۱۰۹۹ء میں مسجد اقصیٰ پر صلیبیوں کا قبضہ ہوا جو اٹھاسی (۸۸) برس تک قائم رہا۔ اور دوسری طرف فتنہ تاتار کے طوفان عظیم نے ہر جگہ تباہی مچا دی۔ پھر تیرہویں صدی عیسوی میں امت مسلمہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی یہ شان ظاہر ہوئی کہ

"ہے عیاں فتنہ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے"

کے مصداق' خود انہی ترکان چنگیزی کا بڑا حصہ اسلام لے آیا۔ انہیں میں سے ترکان تیموری نے ہندوستان میں ایک عظیم الشان مسلم سلطنت کی بنیاد رکھی اور دوسرے یعنی ترکان عثمانیہ نے ابتداء ایشیاء کوچک میں قدم جمائے اور پھر رفتہ رفتہ اس عظیم مسلم مملکت کی بنیاد رکھی جس کی بالادستی ایک طرف مشرقی یورپ تک تھی اور دوسری طرف شمالی افریقہ سمیت پورے عالم اسلام تک۔ گویا خلافت عثمانیہ کے استحکام کے ذریعے ملت کی نشاۃ ثانیہ ہوئی۔

آٹھ صدیوں کے بعد عالم اسلام میں پھر اسی قوت کا خلاء پیدا ہو گیا جو گیارہویں صدی عیسوی میں دولت عباسیہ کے اضمحلال کے باعث پیدا ہوا تھا۔ خلافت عثمانیہ جو صدیوں سے مغربی استعمار

کے سیلاب بلا کو روکے ہوئے تھی' جنگ عظیم میں اس کی شکست کے بعد اتحادی افواج نے اس کے حصے بخرے کر کے برطانیہ' فرانس' اطالیہ اور یونان نے آپس میں تقسیم کر لئے۔ تنسیخ خلافت (۱۹۲۴ء) سے لے کر ۱۹۵۰ء تک مغربی سامراج کے زیر تسلط ان مسلم علاقوں اور ممالک میں بھی وطنیت و قومیت کے جراثیم سرایت کر گئے اور پورا عالم اسلام متحد ہونے کی بجائے چھوٹی چھوٹی قومی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ زیر تبصرہ کتاب "استنبول سے رباط تک" دراصل ۱۹۲۴ء میں تنسیخ خلافت کے بعد رباط کانفرنس ۱۹۶۹ء تک عالم اسلام کے کسی متحدہ نظام یا ادارہ کے قیام کی مساعی کا تاریخی جائزہ ہے۔ فاضل مولف کا یہ تحقیقی مقالہ ہے جو انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے پیش کیا۔ اور زیر نظر کتابچہ اسی مقالے کا ترجمہ اور تلخیص ہے۔ فاضل محقق نے اپنے مقالے کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی (۱) خلافت' حجاز اور سعودی قومی ریاست' (۲) خلافت عثمانیہ کا خاتمہ' (۳) خلافت کانفرنس قاہرہ ۶ مئی ۱۹۲۶ء' (۴) ورلڈ مسلم کانگریس مکہ' جولائی ۱۹۲۶ء' (۵) اقصیٰ اسلامی کانگریس یروشلم' دسمبر ۱۹۳۱ء' (۶) جنگ عظیم دوم کے بعد' (۷) او۔ آئی۔ سی کے قیام سے پہلے کے حالات اور (۸) رباط اسلامی سربراہی کانفرنس ستمبر ۱۹۶۹ء۔

خلافت عثمانیہ کے انتشار کے بعد عالم اسلام کے اتحاد اور ایک متحدہ نظام کے قیام کے لئے جو کوششیں ہوئیں' فاضل مصنف نے ان کا معروضی جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کوششوں اور کانفرنسوں کے تجزیاتی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں مغربی سامراجی طاقتوں نے عالم اسلام کے اتحاد و یک جہتی میں رکاوٹیں ڈالیں اور ان کے خلاف سازشیں کیں' وہاں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ مغربی استعماریت نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مسلمانوں کو ہی استعمال کیا۔ کہیں وطنیت و قومیت کے ذریعے اور کہیں تفرقہ و پروپیگنڈہ کے ذریعے امت مسلم کو منتشر کیا۔ مثلاً بقول محقق "برطانیہ نے عثمانی خلافت کے خاتمے کے لئے شریف مکہ کی مالی' سفارتی اور فوجی مدد کی تاکہ حرمین کو خلیفہ کے کنٹرول سے آزاد کروا کر مسلمانوں کی مرکزیت ختم کی جائے"۔ (ص ۱۴) "اور پھر شریف مکہ کے خلاف ابن سعود کو پانچ ہزار پونڈ کے عوض رام کر لیا" (ص ۱۵)۔ "۱۹۲۴ء میں خلافت عثمانیہ کی تنسیخ کے مسئلہ پر جب قاہرہ میں بین الاقوامی خلافت کانفرنس کے انعقاد کی کوششیں شروع ہوئیں تو ابن سعود سے مکہ میں ایک متبادل کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کروا دیا۔ اور اس کے اعلامیہ میں خلافت کے مسئلے کو سرے سے خارج کر دیا گیا" (ص ۱۶)۔ "قاہرہ کانفرنس اور ورلڈ مسلم کانگریس مکہ بحث و مباحثہ کی نذر ہو گئیں۔ ان سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ ان کا مقصد اسلام کے حقیقی نظام حکومت کو ایک طرف رکھتے ہوئے نئے قومی ریاستی نظام کو پروان چڑھانا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں اقصیٰ

اسلامی کانگریس یروشلم میں منعقد ہوئی جس میں ہندوستان سے علامہ اقبال بھی شریک ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ دارالسلام کی بجائے دارالحرب میں بیٹھ کر عالم اسلام کی یک جہتی و اتحاد کے لئے کوششیں ہو رہی تھیں، جس میں ڈاکٹر محمد اقبال نے خبردار کیا کہ اسلام کو اصل خطرہ صیہونیت اور سامراجی طاقتوں سے نہیں بلکہ ملحدانہ مادہ پرستی اور وطنی قومیت سے ہے" (ص ۴۸)۔

فاضل مولف نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ان سربراہی کانفرنسوں کے شرکاء عوامی نمائندے نہ تھے، بلکہ خاندانی بادشاہتوں یا فوجی آمریتوں کی پیداوار تھے۔ انہوں نے جو فیصلے کئے ان کا مقصد باہمی اتحاد کو مضبوط کرنا نہیں تھا بلکہ "مشترک دشمن" یعنی مقامی اسلامی تحریکوں کے خلاف ایک دوسرے کو مدد فراہم کرنا تھا (ص ۷۰)۔

رباط کانفرنس سے قبل جو سربراہی کانفرنسیں منعقد ہوئیں ان میں اتحاد امت اور عالم اسلام کے استحکام کی بجائے زیادہ تر سطحی مفادات اور اپنی اپنی حکومتوں کے استحکام کے لئے کوششیں زیادہ رہیں۔ مثلاً شاہ فیصل کی ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۹ء تک سربراہی کانفرنس منعقد کرانے کا مقصد جمال عبدالناصر کے مغرب مخالف عرب نیشنلزم اور ملحدانہ سوشلزم وغیرہ کا مقابلہ کرنا تھا (ص ۷۴)۔

۱۹۲۴ء سے لے کر رباط کانفرنس ۱۹۶۹ء تک اسلامی اتحاد کی جو بھی مساعی ہوئیں قوم پرستی اور سیکولرازم کے زیر اثر قومیت کی بنیاد پر اسلامی ریاستوں کے تصور نے انہیں ناکام بنا دیا۔ رباط کانفرنس کو کامیابی ملی تو اس کا سبب اسلام کا وہ عالمگیر تصور تھا جسے مسجد اقصیٰ کے واقعہ سے مہمیز ملی تھی (ص ۱۰۹)۔ آخر میں فاضل محقق یہ مشورہ دیتے ہیں کہ "نظام اسلام کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لئے عالم اسلام کو موزوں قیادت لانے کی ضرورت ہے..... ایسا کرنا مغربی سیکولر جمہوری نظام سے ممکن نہیں، بلکہ اس کے لئے ایرانی انقلاب کی طرز پر مروجہ نظام کے خلاف نکلی جائے" (ص ۱۱۰)۔

المختصر زیر تبصرہ کتاب، عالم اسلام کے اتحاد اور ایک نمائندہ ادارے کے قیام کی کوششوں کا مربوط احاطہ ہے، مگر فاضل مترجم نے مقالے کی ترجمانی کرتے ہوئے اس کی تلخیص پیش کی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس قدر اہمیت کے حامل موضوع کو اصل متن کے ساتھ شائع کیا جائے۔ ظاہر ہے پی ایچ ڈی کے لئے لکھے گئے مقالہ کو استنادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ مذکورہ مقالہ بھی ماخذ و مصادر سے مزین ہوگا، جبکہ مترجم نے کسی ایک حوالہ اور ماخذ کی بھی نشاندہی نہیں کی۔ آئندہ ایڈیشن میں اگر اصل متن کے ساتھ ترجمہ دیا جائے، اور اس کے ساتھ مصادر و مراجع کی بھی نشاندہی کی جائے تو مذکورہ کتاب تاریخی دستاویز کا کام دے سکتی ہے۔

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن اور امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی علمی و فکری اور دعوتی و تحریکی کاوشوں کا نچوڑ

۲۸۰ صفحات پر مشتمل ایک اہم علمی دستاویز جس میں علمی خطوط کی نشاندہی بھی موجود ہے

دعوت رجوع الی القرآن

کا منظر و پس منظر

ضرور مطالعہ کیجئے ـــــ دوسروں تک پہنچائیے

■ سفید کاغذ ■ عمدہ کتابت ■ دیدہ زیب طباعت ■ قیمت مجلد -/۸۰ روپے ■ غیر مجلد -/۶۵ روپے

March 1998 Reg. No. CPL. 126

MONTHLY Vol. 17
Hikmat-e-Quran
LAHORE No. 3

Quarterly Journal of the Qur'an Academy

The Qur'anic Horizons

Patron: Dr. Israr Ahmad

January-March 1998 issue is now available!

CONTENTS

- **Concept of Education in Islam**
  Dr. Absar Ahmad
- **Weaving the Fabric of a Scientific Knowledge**
  John (Yahya Ahmed) Herlihy
- **The Greatness of Prophet Muhammad (SAW)**
  Zafar Ali Qureshi
- **The Roots of Western Culture**
  Charles Gai Eaton (Hassan Abdul Hakeem)
- ***Ahadith:* Significance, Collection, & Criticism**
  Sultan-i-Rome

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an Lahore
36-K, Model Town, Lahore-54700
Phone: 5869501-3 Fax:5834000 E-Mail: anjuman@brain.net.pk